ہیرے پتّھر

علامہ شمر بلوری

تلاش وترتیب

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

"قمر ہلوری مرحوم کو جملہ اصنافِ سخن پر قدرت حاصل تھی۔ قصیدہ، غزل، رباعی، نظم یہ سب میدان ان کے توسنِ فکر کی تگ وتاز سے باعزت قرار پائے۔ وہ زود گو اور پُر گو بھی تھے اور لطف یہ تھا کہ فی البدیہہ بھی کہتے وقت وہ اپنے معیار سے گرتے یا ہٹتے نہ تھے۔ انھیں ہمارے کلاسیکی سرمائے اور فارسی زبان وادب سے کما حقہٗ آگاہی تھی اور اپنے تجردِ علمی، مطالعے کے استحضار اور اعلیٰ حافظے کے ثبوت بھی اپنی گفتگو اور کلام میں مہیا کرتے چلتے، لیکن اس میں کوئی تصنع نہیں ہوتا۔ انھیں عروض اور قافیہ، تاریخ گوئی اور بلاغت کے دوسرے علوم سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کا کلام ہمیشہ نک سک سے درست اور خوش آہنگ اور مرصع ہوتا تھا۔"

— شمس الرحمٰن فاروقی

ہیرے پتّھر

علاّمہ ثمؔر ہلوری

تلاش وترتیب

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

نام کتاب: ہیرے اور پتھّر

شاعر: علامہ ثمر ہلّوری

مرتب: ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

ناشر: ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

آر ایس ۱۶/۳، ٹکیٹ رائے کالونی، لکھنؤ۔۱۷

تعداد: ۴۰۰ (چار سو)

کمپوزنگ: آئیڈیل کمپیوٹر سنٹر، مفتی گنج، لکھنؤ۔۳

کتابت: جناب محبوب حسن

سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

طباعت: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ۔۳

قیمت: ۲۰۰/- روپے (Rs. 200/-)

ملنے کے پتے

۱۔ دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

۲۔ نیو کتاب گھر ہلّور، ضلع سدھارتھ نگر۔۲۷۲۱۹۱

۳۔ حیدری کتب خانہ، مرزا علی اسٹریٹ، بھنڈی بازار، ممبئی

انتساب

علامہ ثمؔر ہلّوری
کے
مداحوں اور قدر دانوں
کے
نام

یہ کتاب

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

کے

مالی اشتراک سے

شائع ہوئی

اس کتاب کے مندرجات سے

اتر پردیش اردو اکادمی کا متفق

ہونا ضروری نہیں

فہرست

☆☆☆

عکس آئینہ

یہ اہل فن سے کہو میرا احترام کریں
کہ میر و غالبؔ و انشاءؔ کی یادگار ہوں میں

.......ثمر ہلتوری

قیاس کہتا ہے کہ جیسے جیسے انسان تہذیب و تمدن کے حوالے سے اپنی شناخت اور اہمیت کا حامل بنتا گیا، ادب کی نشو و نما بھی ہوتی گئی۔ مری بساطِ علم سے باہر ہے کہ ابتدائے آفرینش سے اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کروں۔ ہمارے بزرگ اہل قلم بہت کچھ شعر و ادب پر لکھ چکے ہیں ہماری رہبری اور استفادے کے لیے ان کی تحریریں روشنی کی مانند ہیں، وہی ہم جیسے طالب علموں کے لیے سنگ میل ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ادبی فضا میں آنکھ کھولنے کے سبب شعر و سخن کے بارے میں جو رجحان ہم عمروں میں پنپنے لگا تھا اس نے بڑا فائدہ پہونچایا۔ ہم لوگ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے علمی مباحث سے پڑھنے لکھنے کے زمانے ہی سے کچھ کچھ آشنا ہونے لگے تھے۔ ماضی قریب تک اس موضوع پر بحثوں کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر اب یہ باب تقریباً بند ہو چکا ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے کہ ادب اور زندگی کو جس

زاویے سے دیکھئے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ادب اپنی حدود میں زندگی کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ ماضی و حال کے حقیقی رنگوں کی عکاسی کرتی ہے۔ ادیب و شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ مختلف مسائل و تجربات کو اپنے اسلوبِ بیان سے ادا کرتا ہے۔ بقول سیمابؔ اکبر آبادی:

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے، اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

ادھر ہمارے ناقدینِ کرام کے یہاں ایک اصطلاح بڑے زور و شور سے رواج پا گئی ہے اور وہ ہے 'عصری حسیّت' پھر یہ بھی ہوا کہ ہر شاعر کے یہاں بغیر سوچے سمجھے عصری حسیّت کو تلاش کیا جانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نئی دریافت سے، میں بڑی ذہنی کشمکش سے گزرا ہوں۔ اول تا حال کبھی کبھی الجھنے لگتا ہوں۔ بہر نوع خاکسار نے سیدھے سادے لفظوں میں یہی سمجھا ہے کہ عصری مسائل سے واقف ہونا عصری تقاضوں کا احساس کرنا نیز انہیں اپنے افکار میں فنی طریقے سے رمز و کنایہ میں بالواسطہ بیان کرنا، اب یہ کس کے یہاں نہیں ہوتا؟ قدیم و جدید تمام تخلیق کاروں میں عصری حسیّت اپنے اپنے رنگ اور اپنے اپنے طریقے سے موجود ہے آج مجھے ان سطور کو لکھتے ہوئے بے حد مسرت ہے کہ مردم خیز وطن ہلّور کے ایک ایسے مایۂ ناز تخلیق کار کے کلام کی تلاش و ترتیب کی سعادت و برکت حاصل کر رہا ہوں جو عزلت گزینی کے باوصف ادبی دنیا میں موجب افتخار بنا اور جس کے شعری

اکتسابات روزِ روشن کی طرح عیاں اور تابناک ہیں۔

قصبہ ہلّور کے لوگوں میں روحانی بالیدگی، سیادت اور بزرگی کے ساتھ ہی ساتھ ادبی ذوق وشوق کا رجحان ہر دور میں رہا۔ زمیندار قسم کے لوگوں کی اس بستی میں کتب بینی اور شعروسخن سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ ادبی محفلوں میں حقّے کے اردگرد بیٹھ کر راتوں میں دیر تک داستانِ امیر حمزہ، الف لیلیٰ، قصہ رستم وسہراب اور دوسری داستانیں پڑھی جاتیں۔ غالبؔ، میرؔ، مومنؔ کی غزلوں پر، میر انیسؔ ومرزا دبیرؔ کے مراثی، میر حسنؔ ودیا شنکر نسیمؔ کی مثنوی کے تذکرے رہے۔ آئے دن طرحی وغیر طرحی نشستیں اور مسالمے ہوتے رہتے۔ اسی ماحول نے لوگوں میں سخن فہمی کے ساتھ ساتھ ذوق شاعری بھی پیدا کیا۔ کئی اچھے شاعر وادیب قصبہ ہلّور نے پیدا کئے۔ فراقؔ ہلّوری، قیسؔ ہلّوری، اعجازؔ ہلوری اور عترتؔ ہلوری کا شمار یہاں کے کہنہ مشق شعرا میں ہوتا ہے۔ ان حضرات کو زبان وفنِ شاعری پر خاص دست رس حاصل تھی اور انہوں نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا۔ ان شعراء کا کلام 'نگار' اور 'شاعر' جیسے موقر ادبی رسائل میں شائع ہوتا تھا بطور شاعرانہ تعلّی قیسؔ ہلّوری کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں جس میں انہوں نے خود کو داغؔ سے بڑھ کر زبان داں کے طور پر پیش کیا ہے۔

مالک ملک فصاحت قیسؔ ہلّوری ہوں میں
مجھ سے بڑھ کر داغؔ کی ہرگز زباں دانی نہ تھی

اس کے بعد کی نسل میں احسن ہلوری عزم ہلوری، باقر ہلوری، ثمر ہلوری، زر ہلوری، فہم ہلوری، مائل ہلوری، بدر ہلوری فہیم، شاہد ہلوری وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ موجودہ دور کے شعراء میں جمال ہلوری، شکیل ہلوری، انیس ہلوری، عزیز ہلوری، رزم ہلوری، ابر ہلوری، خورشید ہلوری، صابر ہلوری، درد ہلوری، نایاب ہلوری، بیتاب ہلوری وغیرہ کے نام بطور خاص ہیں۔

علم وادب کے اس گہوارے کے بارے میں محترم لئیق اختر فیض آبادی اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں رقمطراز ہیں:

''میں اکثر کہا کرتا ہوں ہلور میں علم وادب، تہذیب، محبت، خلوص وفا، وضع داری، شاعری، خطابت، صحافت، وکالت، سیادت افسری یعنی حاکمیت ملتی ہے، میرا مشاہدہ یہی ہے۔ دوسروں کا مشاہدہ کیا ہے مجھے خبر نہیں۔ مولانا حیدر مہدی مرحوم کا ایسا منفرد ادیب اب دنیائے خطا بت میں پیدا نہ ہوگا۔ بھائی مہدی حسن، بھائی اطوار حسین رزم، سید حیدر شکوہ، بھائی سید رئیس الحسن ان تمام محترم شخصیتوں کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں، سب اپنی اپنی جگہ منفرد۔۔۔''

پھر علامہ ثمر ہلوری کا سراپا انہیں کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

''گورا چٹا رنگ، بوٹا قد، منہ میں پان، لبوں پر تبسم، موج در موج، شیروانی کے بٹن کھلے، یہ تھے اردو کے جانے مانے،

مقبول خاص و عام قادرالکلام شاعر حضرت ثمرؔ ہلوری۔
ملاقات ہوئی، تعارف ہوا۔ دونوں طرف محویت۔ کون آئینہ
کون عکس، کچھ دیر تو پتہ ہی نہ چل سکا، بارے ہم دونوں
چونکے، بغل گیر ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس مقناطیسی
شخصیت نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ مسدس، مخمس، نظم، غزل،
سلام، نوحہ، قصیدہ ہر رنگ میں منفرد۔''

(نظارہ، لکھنؤ ۱۹۹۲ص۔۱)

بات سے بات نکلی ہے اور جب آراء کا سلسلہ شروع کیا ہے تو بصد احترام شیخ طریقت الحاج مولانا حکیم شاہ سید عزیز احمد حلیمی ابوالعلائی کی آب زر سے لکھی تحریر کو کیوں نہ زینت قرطاس بنایا جائے۔ فرماتے ہیں:

''سردار عبدالرشید خاں (پرنس آف افغانستان) ڈاکٹر محمد
حماد فاروقی مرحوم، (سابق ممبر پبلک سروس کمیشن) خان
بہادر سید وحید الحسن مرحوم (سابق سکریٹری ایجوکیشن بورڈ)
پنڈت پدم کانت مالوی، پروفیسر سید ضامن علی مرحوم اور سید
ہادی حسن صاحب کی ادبی نشستوں میں جن خوش فکر، زود گو،
پختہ کار نمایاں او وجیہہ شاعر سے میری ملاقاتیں ہوتی رہیں وہ
حضرت ثمرؔ ہلوری ہیں جنہیں حال ہی میں آل انڈیا شیعہ
کانفرنس کے کھلے اجلاس میں قومی وادبی خدمات کے صلہ میں

گولڈ میڈل، لسان العصر اور علامہ کے خطابات مل چکے ہیں
اور جن کا جشن منا کر متعدد ادبی انجمنوں کی طرف سے الٰہ آباد،
ممبئ اور لکھنؤ میں سپاس نامے بھی پیش کئے جا چکے ہیں۔ آپ
الٰہ آباد یونیورسٹی کے فرسٹ کلاس پوسٹ گریجویٹ اور
ریسرچ اسکالر رہیں۔ موجودہ غیر مقلدانہ رسم سخن کے حصار کو
توڑ کر ثمر ہلّوری کا فیضان تلمذ خانقاہوں، درس گاہوں،
عدالتوں، وکالت خانوں، دفاتر اور بازار تک دادِ سخن دے
رہا ہے، جو خود موصوف کے درجۂ اجتہاد فن اور منزل استادِ سخن
پر پہونچانے کے لیے کافی ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی ثمر ہلّوری سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار ان
الفاظ میں کرتے ہیں:

''علامہ سید محب الحسن رضوی ثمر ہلّوری مرحوم سے میرے
تعلقات کی مدت پینتس سال سے بھی زیادہ ہے۔ مرحوم مجھ سے
چند سال بڑے تھے۔ لیکن از راہ بے تکلفی و محبت ہم دونوں ایک
دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں نے ان کو ہمیشہ مرنجان
مرنج صاف طینت اور نیک سیرت پایا۔ دوستوں کا وہ خاص لحاظ
رکھتے تھے اور چھوٹوں پر شفقت فرماتے تھے۔''

(نقشِ جاوداں: خورشید ظفر ص ۹)

ثمؔر صاحب کی فنی خوبیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''ثمؔر ہلوری مرحوم کو جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی قصیدہ، غزل، رباعی نظم یہ سب میدان ان کے توسنِ فکر کی تگ وتاز سے باعزت قرار پائے۔ وہ زود گو اور پر گو بھی تھے اور لطف یہ تھا کہ فی البدیہہ بھی کہتے وقت وہ اپنے معیار سے گرتے یا ہٹتے نہ تھے۔ انہیں ہمارے کلمات کے سرمائے اور فارسی زبان وادب سے کما حقہ آگاہی تھی اور اپنے تبحر علمی، مطالعے کے استحضار اور اعلیٰ حافظے کے ثبوت بھی اپنی گفتگو اور کلام میں مہیا کرتے چلتے۔ لیکن اس میں کوئی تصنع نہیں ہوتا۔ انہیں عروض اور قافیہ، تاریخ گوئی اور بلاغت کے دوسرے علوم سے بھی لگاؤ تھا۔ ان کا کلام ہمیشہ یک بیک نوک پلک سے درست اور خوش آہنگ اور مرصع ہوتا تھا۔''

(نقش جاوداں: خورشید ظفر ص ۹)

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی ثمؔر ہلوری کی شاعری اپنی فنی خصوصیات کے ساتھ ہی اپنے عہد کے عصری مسائل کی بھی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔

جناب قیصر عباس رضوی جیسے صاحب نظر کا خیال ہے:

''علامہ کی غزلوں میں فطرت کی زندگی کا وہ شاداب حسن

اور نکھار ملتا ہے جس پر روح بہار لوٹ لوٹ جاتی ہے۔ ان
کے مشاہدہ کی گہرائی اور گیرائی ان کی تیز جمالیاتی حسیات کی
طرف اشارہ کرتی ہے۔ ثمر صاحب کی غزلوں کا دوسرا حسین
اور امتیازی پہلو ان کی تمثیلیت میں مضمر ہے۔ ان کے اشعار
میں تصوریت اور تصویریت کا ایک دلفریب سنگم ملتا ہے۔ ان کی
شاعری ومصوری جو اپنا پر اسرار اندازِ تکلم رکھتی ہے۔"

(نقشِ جاوداں: خورشید ظفر ص۔۱)

ایسے باکمال شاعر کے فن پاروں کا تجزیہ کرنا یا ان پر تنقیدی نظر ڈالنا
مجھ جیسے طالب علم کی بساط سے باہر ہے۔ شعر گوئی کا ذوق اللہ کی دین
ہے۔ علم ومطالعہ اور مشاہدہ وتجربہ کے ذریعہ سے اس پر جلا ہوتی ہے۔
مطالعہ یعنی جو ہروہبی میں اگر تخلیقی عنصر بھی راہ پا جائے تو وہ سونے پر
سہاگے کے مصداق کہلاتا ہے۔ موجودہ دور سائنس اور کمپیوٹر کے اعجازات
سے جگمگا رہا ہے۔ ذہن انسانی نے عملی طور پر اتنی بڑی چھلانگ کبھی نہیں لگائی
تھی۔ اب ایسے صنعتی ماحول میں مادیت کا غلبہ ہونا فطری امر ہے۔ مگر مادیت
سب کچھ دیتی ہے۔ طمانیت کے بغیر کسی نہ کسی منزل پر ہر انسان اپنے میں کچھ
کمی محسوس کرتا ہے۔ ایک بے نام اضطراب اسے پریشان کرتا ہے۔ عموماً وہ
سمجھ نہیں پاتا تمام آسائشیں ہونے کے باوجود ادھورا پن کیوں ہے؟ حقیقت
یہ ہے کہ ادب کے حوالے سے ہمیں زندگی کے بہت سے اسرار معلوم ہوتے

ہیں۔ ادب زندگی کی کڑی دھوپ میں ایک شجر سایہ دار کا کام دیتا ہے۔ عصری تقاضوں کی بات ہو، اخلاقیات و اقدار کی گفتگو ہو، ادب سیدھے سادے انداز اور اختصار و ایجاز کے پردے ہی میں بڑی بڑی باتیں بتاتا ہے۔ جو فلسفے کی موٹی موٹی کتابیں نہیں بتاسکیں۔ اردو ادب عالمی ادب کے بہترین تخلیقات میں شمار کیا جاتا ہے، پھر اردو شاعری کا تو کوئی جواب نہیں۔ میرؔ و غالبؔ، انیسؔ و اقبالؔ ہیں جو بین الاقوامی سطح پر عظیم مرتبے کے حامل ہیں اور ان کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔

مگر روشنیوں کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ ایک زنجیر کی طرح پھیلتا جارہا ہے۔ اردو شاعری میں غزل کو بڑی محبوبیت حاصل رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ موضوعات میں تنوع اور اسلوب کی تبدیلی غزل کی شناخت ہے۔ یہ دلوں کی بات کرتی ہے، پرانی قدروں کی عظمت بتاتی ہے، ٹوٹتی بکھرتی قدروں کے نقصان کا احساس کراتی ہے۔ محبت اور انسانیت کے فروغ پر توجہ دلاتی ہے۔ علامہ ثمرؔ ہلّوری عصر حاضر کے ان عظیم المرتبہ شاعروں میں ہیں جنہوں نے خونِ جگر سے کشت سخن کی آبیاری کی ہے۔ قدیم وجدید کا سنگم، کلاسکی آداب کو برتنے کا ہنر، زبان و بیان پر قدرت ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ جب سچا فنکار غزل کے پُرخار دشت میں پھول کھلاتا ہوا منزل کی طرف بڑھتا ہے تو دیگر اصناف سخن پر اس کو بہ آسانی قدرت حاصل ہوجاتی ہے۔ اس لیے رثائی شاعری ہو، قصائد کی شاعری ہو، نظم

کی شاعری ہو وہ ہر جگہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ علامہ کی شاعری میں بے حد تاثیر پائی جاتی ہے۔ جو صرف مشق و مزاولت سے نہیں آتی۔ بلکہ بقول غالبؔ ع

غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

جب ثمرؔ ہلوری کی فنکارانہ چابکدستی اور ماہرانہ صلاحیت کو محدود کرتے ہوئے اپنی بات مختصر ترین کر دی تھی تو اچانک ایک خیال ذہن میں ابھرا کہ ایسے صاحب فکر و نظر سے فن پارے عوام و خواص کے سامنے کتابی صورت میں آرہے ہیں کہ جس نے کبھی تشہیر کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا، کبھی اپنی خودستائی نہیں کی، ہمیشہ منکسر المزاجی اور خاکساری کو ہی طرۂ امتیاز بنایا۔ ایسے باکمال کے بارے میں تفصیل سے ضرور گفتگو ہونی چاہئے۔ تاکہ آنے والی نسلیں کما حقہ ان کی شاعرانہ عظمت سے واقف ہو سکیں۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۹۲ء میں ثمرؔ صاحب خلد آشیاں ہو گئے۔ جناب اشتیاق حسین، ساغرؔ لکھنوی نے قطعہ تاریخ کہا:

لسان اللہ کے یہ مدح خواں تھے
تھی حاصل شاعری میں ان کو معراج

پھر استقبال کرتا کیوں نہ رضواں
ثنائے شاہ کا دیکھا ہو جب تاج

یہ ہے تاریخ زبر و بینہ میں
محبِ شہ ثمرؔ پہونچے جناں آج

۱۹۹۲ء

قیصرؔ جونپوری نے یوں اظہار خیال کیا:

دل کو سکون ملتا رہا شور و شین میں
گذری حیات مدح شہ مشرقین میں

رضوان سے کہہ رہے ہیں ثمؔر آن بان سے
لے کر قصیدے آئے ہیں خلدِ حسین سے

۱۴۱۲ھ

حقیقت یہ ہے کہ علامہ ثمؔر کے اٹھ جانے سے ادب میں جو خلا پیدا ہوا اس کا پر ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ ایسے باکمال مدتوں بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ بقول میر تقی میؔر ؎

برسوں لگی رہے ہیں جب مہر و مہ سے آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

ان کی وفات پر اہل فکر و نظر نے جس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا وہ اس امر کا عکاس ہے کہ قوم کی قوم اس غم سے تڑپ اٹھی۔ یہاں ان شعراء وادبا کے افکار پیش نہیں کر سکتا ورنہ ایک دفتر انہیں تاثرات پر مشتمل ہوتا۔ یہ ان کا تمام کلام نہیں ہے، اس کے علاوہ دیوانِ ثمر اور مراثی ثمر کے عنوان سے بھی کتابیں مرتب کی جارہی ہیں۔ ثمؔر ہلّوری نے تمام اصناف سخن کو برتا اور اپنی صلاحیت کے خوب خوب جوہر دکھائے۔

ثمؔر ہلّوری کی غزلوں کے بارے میں چند باتیں عرض کروں گا۔ بقولِ شخصے وہ اردو کی دنیا میں جیتے، رہتے بستے اور لکھتے پڑھتے تھے، سوچتے اور سانس بھی اردو ہی میں لیتے تھے۔ دراصل اردو ہی ان کی زندگی تھی یہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ چنانچہ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ غزل میں وہ اپنے انوکھے ہنر

سے چار چاند نہ لگا دیتے، غزل میں عام طور سے جیسا کہ اس پر الزام بھی لگا۔ یہ الزام بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ اس میں عام جنسی جذبات کی زیادہ ترجمانی کی جاتی ہے، یہ ضرور ہے کہ اس تنگنائے کو کچھ لوگوں نے وسعت دینے کی کوشش کی اور اس کی اس کمزوری کا شکوہ بھی شاعرانہ پیرائے میں کیا لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ غمِ دل اور غم زمانہ کے ساتھ ساتھ دل کش پیرائے میں کچھ کام کی باتیں بھی کی ہیں۔ ان جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے جو ابھی پردۂ خفا میں تھے۔ غزل عورتوں سے باتوں کا ہی نام نہیں ہے یہ بات ثمؔر صاحب نے اپنی غزلوں کی تخلیق سے ثابت کردی ہے۔ غزل میں ان کی زبان میں نرمی، لوچ اور حلاوت کے ساتھ ساتھ اک خاص مزہ ہے، ان کی غزل میں سوقیانہ پن، معاملہ بندی یا ابتذال بالکل نہیں ہے۔ اس میں ایک سلیقہ، گہری فکر مندی، جذب دروں کی عکاسی، جذبات نگاری کا اعلیٰ انداز اور خوش فکری کے علاوہ دل کے تاروں کو چھو لینے والی باتوں کی کمی نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ ترقی پسندانہ رویہ بھی موجود ہے۔ چونکہ ہلّور کا لسانی تعلق بہ نسبت دہلی کے لکھنؤ سے زیادہ ہے۔ لہٰذا لکھنؤ سے وابستہ ہونے کی بنا پر ان کو یہیں کے اسلوب کا احیا کرنا چاہئے تھا۔ مگر آپ ان کے کلام کا مطالعہ فرمائیں ان دونوں اسکولوں کی راہ سے ذرا ہٹ کر انھوں نے اپنی راہ متعین کی ہے۔ بلا شبہ وہ اس طرح صاحب طرز کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان پر کسی بھی اسکول کی کاسہ لیسی کا حکم نہیں لگایا

جا سکتا، شاعری میں ان کا اپنا خود ایک انداز تھا جو وہ برتتے تھے۔ ان کا شعور بہت پختہ تھا، وہ انگریزی فارسی، عربی ہندی وغیرہ زبانیں بخوبی بولتے اور لکھتے تھے۔ ان کے بیانیے دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب کے بیشتر بہترین نمونے تھے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان سے استفادہ نہ کرتے۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ وہ ایک باخبر اور صاحب فکر شاعر تھے۔ فنی ضوابط پر کامل دست رس رکھتے تھے۔ ان کا مزاجِ شاعری ہموار، سنجیدہ اور متین ہے۔ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جس میں دنیائے تصوف کی رسائی جھلکتی ہے۔

میں دیکھتا ہوں نگاہوں سے اپنی جو منظر
نگاہِ اہلِ خرد سے وہ آج تک ہیں نہاں
یہ میرا ظرف نظر ہے کہ میں نہیں بے ہوش
نہیں میں امتیٔ شوق موسیٰ عمراں

ایک دوسری جگہ یوں کہتے ہیں:

مجھ پہ وحشت کا نہ جانے کس لیے الزام ہے
کھینچتا ہے اپنی جانب خود سے ویرانہ مجھے

عشق سے متعلق یہ شعر دیکھئے:

عشق بحر بیکراں ہے، عشق ہے بحرِ عمیق
کون اندازہ لگا سکتا ہے اسکی تھاہ کا

ثمر ہلّوری کی غزلوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے

یہاں خیالات کی پختگی، جذبہ کی متانت، زبان کی طہارت اور بیان کی سادگی کے بنیادی خدوخال واضح نظر آتے ہیں۔محرومی و مایوسی کے باوجود ان کی غزلوں میں شوخی ورنگینی پائی جاتی ہے۔ان کی غزلوں کے چنداشعار ملاحظہ ہوں:

خدا ہی جانے یہ ہے کون وادیٔ بے نام
جہاں سفر کی اجازت ہے اور نہ اذنِ قیام
خبر نہیں اسے کچھ انقلاب عالم کی
دلِ غریب کو بس اپنے کام سے ہے کام
شکست کاسۂ صد آرزو سہی لیکن
مرے سوال نے بخشا ہے مجھ کو فخر کلام

تنہائی میں اکثر مجھے محسوس ہوا ہے
یادوں کے دریچوں سے کوئی جھانک رہا ہے

اے چارہ گرو تم نے سنا ہو تو بتاؤ
آخر مرضِ عشق کی بھی کوئی دوا ہے

اس کا جینا ہے موت سے بدتر
جس کو مرنے کا حوصلہ نہ ہوا

عشرتِ موہوم کی امید میں جینا پڑا
زندگی اس دور میں انساں کی ہے دوبھر بہت

ہم سمجھتے تھے کہ آساں ہے محبت کرنا
ہم کو معلوم نہ تھا عشق میں ہوتا کیا ہے
تم کو معلوم نہیں عشق کی دنیا ہے وسیع
ابھی کم عمر ہو تم نے ابھی دیکھا کیا ہے

اک حرف آرزو کو فسانہ بنا دیا
اک بات بڑھ گئی ہے سوال و جواب میں

ہائے اس عاشقِ ناکام کی تقدیر کہ جو
تیرا پیغام رقیبوں کی زبانی مانگے

لفظ کو اصل حقیقت سے جدا رکھا ہے
ضبط کا نام زمانے نے وفا رکھا ہے

حرم کے پاس زمینیں کئی ہیں افتادہ
جو تم کہو تو ہمیں مے کدہ بنا ڈالیں

ہماری راہ میں سو بار آئے
تھرکتے، ناچتے یادوں کے سائے
کہانی میری بھی غمگین تھی کیا
ثمر روئے بہت اپنے پرائے

مجھ کو کہتے ہیں ثمر وارثِ میراثِ سخن
باعثِ فخر صنادید ہنر ہوں یارو

ذوقِ ناکامی ابھی تشنہ ہمارے دل میں ہے
زندگی کا راز پنہاں سعیٔ لاحاصل میں ہے

اس لیے صحرا نوردی بھی ہے لذت آفریں
دشت کی وسعت بھی شامل جادۂ منزل میں ہے

کل ثمؔر یہ کہہ رہے تھے مجھ سے ارباب شعور
لذتِ فکر وفراست آج کے فن میں نہیں

غزلیات کے بعد ان کی نظموں کا مطالعہ کرنے پر یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے نظموں میں فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ یوں تو انہوں نے ۱۹۴۸ء کے آغاز میں اپنی دلنشیں آواز شعر وشاعری کے لہجہ میں بلند کی اور ایک حسین نظم کی تشکیل کی اس طرح وہ روایتی شاعروں کی عام ڈگر سے ہٹ کر یہ انفرادیت بھی رکھتے ہیں کہ بجائے غزل کے جو عام طور سے ابتدا میں سبھی شعراء کہتے اور پڑھتے آئے ہیں۔ انہوں نے اس کے برعکس ایک مشکل صنف سے شروعات کی۔ اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظم میں جب تک شاعر کا ذوق رچا ہوا اور تجربہ ومشاہدہ پختہ نہ ہو وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ نظم میں شعوری ربط اور شاعر کا وجدان خوبصورتی سے برتنے کے ساتھ ہی الفاظ کا دروبست بھی قرینے سے ہونا چاہئے۔ نظم کا میدان زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اس روشنی میں علامہ ثمؔر کی نظموں کا مطالعہ کیجئے تو یہی لگتا ہے کہ جیسے ساری عمر نظمیں ہی کہتے رہے ہوں گے۔ چونکہ نظموں میں موضوعات اور

نظم وضبط ایک کمال ہے۔ 'شکست' کے عنوان سے ایک مختصر نظم کے شعر پیش کر رہا ہوں:

کس نے دی پھر مرے غم خانے کے در پر آواز
شمع کشتہ کو، جلا آہ! تری عمر دراز
یہ سن وسال کی لَو دیتی ہوئی دھوپ بتائے
چہرے کمہلا گئے کیوں اجنبی کیوں ہے آواز
دو دل اس گردش ایام کے صحرا میں رہے
اس طرح جیسے سدا سے رہے بیگانہ ساز
آشنا ہوتے ہوئے اجنبی بنتے ہی گئے
نہ اٹھا پردۂ بیگانگیٔ ناز و نیاز
ہائے وہ عشق جو پردے میں رہا تابہ حیات
لب تک آیا نہ کبھی بھول کے بھی جس کا راز
کوئی بائیس برس گذرے کہ اک دختر ماہ
جس کا چاندی کا بدن تھا کبھی سیماب گداز
جس کی آنکھوں میں مئے ناب نظر میں بجلی
شعلۂ خرمن احساس تھی جس کی آواز
تربیت یافتہ نظروں میں جوانی کا رچاؤ
ہر ادا جذبۂ بیتابی دل کی غماز

رہزنِ ہوش و خرد کفر کا بھرپور شباب
یاد تک جس کی بنی دشمنِ اوقات نماز

اس طرح 'عصمت علم' بھی بڑے معرکے کی نظم ہے۔ اس نظم میں علم کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

علم آدم کے لیے وجہ فضیلت ٹھہرا — روزِ اول یہی معیار خلافت ٹھہرا
علم ہی چشمہ تقدیس وکمالات بنا — وجہ اعزاز بنا موجب عصمت ٹھہرا
علم ہی نورِ ازل علم ہی عقلِ اول — علم اکلیل شرف فرقہ عزت ٹھہرا
علم نے منزل معراج میں رکھا جو قدم — شمعِ دیں محفل کونین کی زینت ٹھہرا
علم لوح وقلم وصحفِ سمٰوات کی روح — علم سرمایۂ آئینِ شریعت ٹھہرا
وجہ تفضیل بنا حضرت آدم کے لیے — علم ہی جوہر اخلاق وشرافت ٹھہرا
علم ہی نورِ محمد کی دلیل روشن — علم ہی تاجِ شرف حسنِ نبوت ٹھہرا
علم کا شہر محمد کو بنایا حق نے — نفسِ حق باب کمالات رسالت ٹھہرا
ذات حیدر کی بنی جب کہ درِ علم نبی — علم تب جا کے کہیں قابلِ شہرت ٹھہرا

'رخِ جمیل' کے عنوان سے یہ دو شعر کس غضب کے ہیں ملاحظہ ہوں:

ترے رخِ جمیل کا جمال مسکرا اٹھا
خطوط جسم ہنس پڑے تو خال مسکرا اٹھا
تصورات کی جبین پاک جگمگا اٹھی
حدود عقل و ہوش میں خیال جگمگا اٹھا

'آئینہ جوٹوٹ گیا' ایک عنوان ہے جس کے تحت یہ دو شعر:

خود فراموش بنایا مری بیتابی نے
دامنِ صبر و سکوں ہاتھ سے یوں چھوٹ گیا
دل جو ٹوٹا تو کئی بار یہ آواز آئی
آئینہ ٹوٹ گیا، ٹوٹ گیا، ٹوٹ گیا

'لیڈر' کے عنوان سے ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہو:

جدھر دیکھو بشر مصروف در دنفسی نفسی ہے
درونِ شہر و قریہ ہر جگہ حسرت برستی ہے
وہ ہو مزدور یا دفتر کا بابو یا ہو پیشہ ور
گرانی کے سبب سے سب کا جینا ہوگیا دوبھر
فضائے دہر پر سناٹا ہے اک ہو کا عالم ہے
جو ہیں بیکار رشوت خور شہرت کا انہیں غم ہے
عوام الناس کی کشتی کو تنکے کا سہارا ہے
مخالف ہے ہوا طوفانِ غم کا تیز دھارا ہے
پریشانی کے عالم میں لگائے سر پہ اک ٹوپی
بدن میں بنگلہ کرتا اور پاجامہ ہے یا دھوتی
کہیں ہے شیروانی اور کہیں صدری ہے زیب تن
ہے چپل پاؤں میں گردن میں ہے کپڑے کا اک بندھن

جہالت کے اندھیرے میں بدل کر بھیس لیڈر کا
صفایا کر رہا ہے برملا وہ قوم کے گھر کا
ڈراما کھیلتا ہے قوم کے اسٹیج کے اوپر
یہ محوِ خواب رہتا ہے گلوں کی سیج کے اوپر

'۲۶/جنوری کا عہد نامہ' نظم کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں جن میں ہندی کے الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ اردو سے گلے مل رہے ہوں:

بھارتی ہوں کہ جنم بھومی ہے بھارت میری
اپنے لفظوں کی صداقت کی قسم کھاتا ہوں
عہد کرتا ہوں وفادارِ وطن ہونے کا
اپنے اس قول کی عزت کی قسم کھاتا ہوں
رکھوں گا پیش نظر اپنا مقدس دستور
اپنے جمہور کی عظمت کی قسم کھاتا ہوں
ہر طرح دیش کی عزت کا مجھے ہوگا خیال
دوستو سن لو میں بھارت کی قسم کھاتا ہوں

یوں تو ان کی لاتعداد نظمیں حب وطن سے سرشار ہیں لیکن جو سوز و گداز 'جنگ آزادی کے شہدا کے نام' میں ہے وہ ان کے جذبۂ قومی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

ہم نے مانا کہ بہار آئی ہے گلشن میں مگر
قید ہے رنگ میں خود اپنے یہاں کا گل تر
آتش گل سے جلا جاتا ہے لالہ کا جگر
یہ بھی شاید نگہِ حسن کی صیادی ہے
نقشِ غم آج بھی ان لوگوں کا فریادی ہے
خون سے جس کے خریدی ہوئی آزادی ہے

’حب وطن‘ سے سرشار نظموں کے علاوہ ہندوستان کی تہذیبی وراثت پر بھی انہوں نے نظمیں کہیں ہیں جس میں ’تاج محل‘ کا ایک خاص مقام ہے اس نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے تاج محل کو ایسا بت تصور کیا ہے جو کسی بھی وقت نہ صرف بول سکتا ہے بلکہ عاشق کا راز کھول بھی سکتا ہے۔

راز الفت کسی عاشق کا کہیں کھول نہ دے
عشق کا بت ہے، میں ڈرتا ہوں کہیں بول نہ دے

’’تاج محل‘ کے حسن کی تعریف میں یہ شعر تاج کے ماتھے کا جھومر ہے۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا ۴۷ واں جلسہ ۱۴، ۱۵ر جولائی ۱۹۷۳ء کو قصبہ ہلّور میں منعقد ہوا اور اس موقع پر ’صدائے دل‘ کے عنوان سے جو نظم انہوں نے پڑھی۔ اس کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ قومی منفعت سے قطع نظر اس نظم کے محاسنِ کلام قابلِ دید ہیں:

یہ زمیں قصبۂ ہلّور کی پر نور زمیں
حسن فطرت کے تقاضوں سے ہے بھرپور زمیں

جلوۂ حق سے بہر طور ہے معمور زمیں
اہل بینش کے لیے آئینۂ طور زمیں
دامن آلِ عبا سایۂ فگن ہے اس پر
ناز فرمائے جہاں میرا وطن ہے اس پر

جبکہ حضرت محل آمادۂ ہجرت ہوکر
ساتھ شہزادۂ برجیس کے بہ ایماءِ سفر
سوئے نیپال روا نہ ہوئی تھیں بے لشکر
ٹھہریں ہلّور میں آکر بصد اجلال وفر
اسی ہلّور سے ان کو بھی مددگار ملے
گئے نیپال تک اس طرح کے غمخوار ملے

آؤ اور قصبۂ ہلّور میں آکر دیکھو
تذکرہ آلِ پیمبر کا ہے گھر گھر دیکھو
یہ عزا خانۂ فرزند پیمبر دیکھو
شوق سے مسجد و درگاہ کا منظر دیکھو
ان مزارات مطہر کی زبانی سن لو
'میرا بابا'[1] کے تقدس کی کہانی سن لو

---

[1] شاہ سید عبدالرسول، جن کا مزار ہلّور میں مرجعِ خلائق ہے۔

ثمر بلوری نے جو کچھ لکھا نہایت بے باکی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھا۔ جہاں دلنشینی ان کے کلام کی جاذبیت ہے وہیں تندی و ترشی بھی برمحل نظر آتی ہے۔ تقسیم انعامات پر ادبی انعام، کے عنوان سے ان کی نظم کا ہر مصرعہ تیغ آبدار بنا دکھائی دیتا ہے۔

ادب کے باغ کے پھولوں کو چھانٹنے والو
ادب کے نام پر انعام بانٹنے والو
تمہیں خبر ہے کہ انعام کس کو دیتے ہو
مئے وقار کا یہ جام کس کو دیتے ہو
ملا جو قوم کا سرمایہ بہر ملت فن
بنا وہ اندھے کی ریوڑی ہوا اگر تقسیم
یہ دوست ہیں کوئی افسر ہیں یا صحافی ہیں
ہزار جہل مرکب سہی مگر ہیں عظیم
نہیں یہ بھیک جو دی جائے عیب داروں کو
اپاہجوں کو تمہارے وظیفہ خواروں کو

'زندگی' کے عنوان سے ایک نظم ملاحظہ ہو:

دن کے جلووں میں بہر ضوفشاں ہے زندگی
رات کی تاریکیوں میں بھی نہاں ہے زندگی
مسکراتے پھول کی نس میں رواں ہے زندگی

اور کمھلائی کلی پر نوحہ خواں ہے زندگی

حسن کی رنگینیوں میں شادماں ہے زندگی

عشق کی صورت میں بھی گریہ کناں ہے زندگی

خار وخس کی شکل میں گر آشیاں ہے زندگی

بھیس بدلے برق کا شعلہ فشاں ہے زندگی

ہر شئے موجود کا راز نہاں ہے زندگی

گاہ پابندِ مکاں گہہ لامکاں ہے زندگی

اس طرح کی برجستہ اور برمحل اشعار سے ثمرؔ ہلّوری کا کلام مملو ہے۔ فکروفن میں ایسا حسین امتزاج ہے کہ ہر مصرعہ پر سبحان اللہ نکلے۔ یقیناً اس کو خدا کی دین کہتے ہیں ابتدا میں جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ علامہ نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور اس صنف کے فن کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔ قصائد میں بھی ثمر ہلّوریؔ کی اپنی الگ شناخت ہے۔ انہوں نے حضرت محمد مصطفےٰؐ کی شان میں جو قصیدہ رقم کیا ہے اس کی تشبیب، گریز اور مدح کا جواب نہیں۔

خلق ہو کر میں ہوا کچھ یوں پشیمان وجود

ہو گیا رخصت جو دل میں تھا وہ ارمان وجود

زندگی کی پھانس بن کر تھی تنفس آشنا

اضطراب آثار یہ زلفِ پریشانِ وجود

جب ہوائے عشق راس آئی تو آخر بن گیا
باعث خنکیِ چشم و دل گلستانِ وجود

سوسنِ لب، سنبل گیسو، گلِ رخ، سروِ قد
نرگسِ دیدہ یہ مژگاں، حسن ترکان وجود

یہ علاماتِ تصوّر آفرین وحِس نواز
بن گئے ہیں باعثِ ادراک و وجدانِ وجود

دیدۂ دل مائلِ بادہ کشی ہوکر تو دیکھ
ہوش میں لاتا ہے کیسے جامِ عرفان وجود

لحہ لحہ ہے اسیر پنجۂ مرگ و حیات
وقت کے ہاتھوں میں ہے اک جام گردانِ وجود

زندگی دشوار کر دیتے ہیں اہل عشق پر
یہ جوانی رس، پری وش، فتنۂ سامانِ وجود

ذوق خوددر بینی کرے پیدا جو امکانِ وجود
ذہن انسان کو ملیں کیسے نہ عنوان وجود

اللہ اللہ دستِ فکر خودنمائی کے طفیل
ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا از خود گریبان وجود

احمد و زہرا و حیدر، شبرّ وشبیر سے
خلق خالق نے کئے ہیں پانچ ارکان وجود

تا ابد روشن رہے گا یوں ہی دارِ زندگی

ذاتِ پاک مصطفےٰ ہے شمع ایوان وجود

مطلع مدحت سے ہوتی ہے ثنائے مصطفےٰ

بزم میں کرتا ہوں آغاز قرآن وجود

اسی طرح انہوں نے حضرت علیؑ اور دیگر ائمہ کی شان میں بہترین قصیدے لکھے ہیں۔

اسی طرح ان کی مثنوی 'شمع کشتہ' اور مثنوی 'فریب منزل' دیکھئے کیا بے ساختگی اور لطف زبان ہے۔ ملاحظہ ہو، مثنوی شمع کشتہ کے چند اشعار ؎

زمانے کا بدلا ہوا ہے مزاج

جنم لے چکا ہے نیا اک سماج

شہنشاہیت اب بری چیز ہے

حکومت رعایا ہی کی چیز ہے

حکومت کا لیکن نہ بدلا مزاج

جو تھا کل طریقہ وہ ہے اس کا آج

حکومت بھی اپنی ہے قانون بھی

بڑی زود اثر ہے یہ معجون بھی

ثمر ہلوری نے اردو ادب کی برتی جانے والی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنے باکمال ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ یہاں تک کہ

مشکل ترین صنف یعنی مرثیہ، جس کو غالبؔ جیسے 'رب النّوع' پرگوسخن ور، جن کو ہر صنف سخن پر دسترس حاصل تھی، اس شاعر نے مرثیے کے چند بند کہہ کر اسے چھوڑ دیا تھا کہ یہ کام صرف انیسؔ و دبیرؔ ہی کا ہے، اس کے لیے مجھے ایک اور زندگی چاہئے۔ مگر ثمرؔ ہلوری نے اس میدان میں بھی قادرالکلامی کے جوہر دکھائے۔ مرثیہ گوئی میں ثمرؔ ہلوری کا بڑا مرتبہ ہے۔ ویسے تو واقعات کو مسدس کی شکل میں ان کے پیش رو معراج کمال پر پہونچا گئے تھے مگر بقول اقبالؔ مقاماتِ آہ وفغاں اور بھی ہیں۔ ثمرؔ ہلوری کے مراثی نہ صرف قدرت کلام کے بہترین نمونے ہیں بلکہ وہ پہلی صف کے شعراء میں کہیں نہ کہیں ضرور کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کے مرثیوں کے بارے میں اگر لکھا جائے تو کئی صفحات کی ضرورت پڑے گی۔ وہ کم ازکم ہر سال ایک مرثیہ ضرور کہتے تھے اور یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک قائم رہا یعنی ان کی حیات تک۔ اس طرح ان کی شاعری میں اس اہم صنف سخن میں قیمتی اضافہ ہوگیا تھا۔ تعجب ہے کہ ان کی مرثیہ نگاری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ نہ جانے کیوں؟ یا اس صنف سخن پر لکھنے والوں نے ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی جبکہ مرثیہ میں انہوں نے بڑی بیدار مغزی اور سمجھ داری کے ساتھ ساتھ رونے اور رلانے والی کیفیت کا مرثیہ، کو پابند نہیں رکھا، بلکہ اس میں معرکۂ کربلا اور کربلا کے شہیدوں کا اصل پیغام اور امام حسینؑ کے کردار کا بانکپن بہ حسن وخوبی ظاہر کیا ہے۔ امامؑ کے کردار سے جو پیغام اور نصیحت بیمار اور کمزور معاشرے کو حاصل ہوسکی ہے اور

انسان جس طرح سر اٹھا کر آزادی کے ساتھ حریت کے گیت گاتے ہوئے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ انہوں نے یہ پہلو اپنے مرثیوں میں بخوبی اجاگر کئے ہیں۔ پردۂ قصر عروس شب مہتاب اٹھا (درحال حضرت عباسؑ) مرثیہ کی ابتدا یوں کرتے ہیں:

پردۂ قصرِ عروسِ شبِ مہتاب اٹھا بحر انوار میں تسلیم کو گرداب اٹھا
غل یہ گلشن میں ہوا نور کا سیلاب اٹھا آنکھیں ملتا ہوا پھر سبزہ کم خواب اٹھا
غنچے کھِل کھِل کے اذانِ سحری دینے لگے
پھول ہنس ہنس کے نشانِ سحری دینے لگے

یوں نظر آنے لگی قدرت رب قادر حکم کوثر کو ملا جب کہ وضو کی خاطر
جام آب آئی لئے شبنم تر بالآخر جم گئیں باغ میں پیڑوں کی صفیں متواتر
اہل گلشن ہوئے آمادہ جو طاعت کے لیے
گلِ گلزار نبی آیا امامت کے لیے

باغ میں سیر سیاحت کے لئے آئی ہوا حمد آہنگ عنادل کا ترانہ گونجا
کلیاں چٹکیں تو ہوئی پیدا دردوں کی صدا کھِل اٹھے پھول تو گلزار عبادت مہکا
فرض نے پھیرا جو رخ قادر مطلق کی طرف
متوجہ ہوئے سب تذکرۂ حق کی طرف

اس مرثیہ کی زبان و بیان انتہائی دل نشیں اور لب و لہجہ دل آویز ہے، انہوں نے اس صنف میں وہی زبان استعمال کی ہے جو مرثیہ کے

وقار کے لئے مناسب ہے۔ چند بند ملاحظہ ہو ے

آیا مشکل سے مقابل میں اگر کوئی شقی
شرم احباب سے کی اس نے مبارز طلبی
شان کے ساتھ پکارا یہی عباس جری
ابتدا جنگ کی کر دشمنِ اللہ و نبیؐ

زشت خو، پست، دنی، بندۂ زر تیغ اٹھا
آبرو و باختہ، مردود سیر تیغ اٹھا

اس نے آغاز کیا جنگ کا تلوار چلی
پھر تو عباسؑ کی بھی تیغ شرر بار چلی
سر و گردن پہ لگاتی ہوئی اک وار چلی
روح دشمن کی بصد بخوف سوئے نار چلی

مل گئی خوب سزا مسلکِ بیبا کی کو
روح نے چھوڑ دیا خود جسد خا کی کو

میں نے بطور نمونہ ثمرؔ صاحب کے دو بند پیش کئے ہیں۔ یہ مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں ہے۔ پورا مرثیہ زبان و بیان کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ شروع سے آخر تک انتہائی چابک دستی سے مضامین کو کمالِ ربط کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے آگے بڑھے ہیں۔ مرثیے میں مرثیت کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی تکنیک جس کو ہم آسانی کے لیے ڈرامائی انداز کہہ سکتے

ہیں، بہت ہوشیاری سے برتی ہے۔

ثمرؔ صاحب نے میر انیسؔ کی تاسّی کرتے ہوئے اس بند کو اپنے مرثیہ میں بہ کمالِ خوبی برتا ہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ ان کے شعور کی گرمی اور خونِ دل اس میں شامل نہ ہو۔ میں چند بند حضرت عباسؑ کے اس وقت کے دے رہا ہوں جب حضرت عباسؑ دریا کی طرف پانی لینے گئے ہیں اور فوج یزیدی سدِ راہ ہے۔ اس منظر کو انہوں نے جس بے تکلفی سے پیش کیا ہے وہ قارئین کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس طرح ان کے تمام مرثیے ان کی قادر الکلامی اور فنی پختگی کے غماز ہیں۔ مرثیہ کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

قوت بازوئے شاہ شہدا ہے عباسؑ
درسگاہِ عمل وعزم ووفا ہے عباس
قہر آثار مشیت کی ادا ہے عباس
اسد بیشۂ ضرغام خدا ہے عباس
حرب وضرب ایسی کہ حیدر کا گماں ہوتا ہے
ہاتھ کٹنے پہ بھی جعفر کا گماں ہوتا ہے

فدیۂ راہ خدا عاشق مظلوم ہے یہ
حشر تک نام علمدار سے موسوم ہے یہ
غمگسارِ شہ دیں بیکس ومغموم ہے یہ
صاف کہتا ہے یہ کردار کو معصوم ہے یہ

عابد و زاہد اور ایمان کا پیکر یہ ہے
کہہ دوں میں مختصراً ثانی حیدر یہ ہے

لفظ بے معنی تھا ہمت جو نہ ہوتے عباس
حرفِ بے صوت تھا جرأت جو نہ ہوتے عباس
خواب مہمل تھا رفاقت جو نہ ہوتے عباس
کیا وفا کی تھی ضمانت جو نہ ہوتے عباس
دوستی اور محبت کو قضا آ جاتی
یہ نہ ہوتے تو شجاعت کو قضا آ جاتی

تلوار کی تعریف میں اس طرح طب اللسان ہیں۔ مرثیہ کے چند بند دیکھیے ؎

باگ پر ہاتھ رکابوں میں ہیں پائے اطہر
سوئے اعدا بڑھا جاتا ہے علیؑ کا دلبر
حملہ کرتا ہے تو ہو جاتا ہے تِربھر لشکر
کوئی گرتا ہے ادھر بھاگتا ہے کوئی ادھر
ہے جلالی پسر شیر خدا کی صورت
تیغ عباسِ کی چلتی ہے قضا کی صورت

تیغ عباس نے اعدا پہ اٹھائی دیکھو
چومکھی ہوتی ہے کس طرح لڑائی دیکھو
حملہ ور شیر بہر سو ہے ترائی دیکھو
سر اڑے جاتے ہیں ہاتھوں کی صفائی دیکھو

غل یہ میداں میں اٹھا ہوش سنبھالو بھاگو
جان اپنی جو بچانی ہے بچالو بھاگو
آب ایسی ہے کہ کہتے ہیں ہے آبی تلوار
ہوگئی پی کے لہو آج گلابی تلوار
مست پھرتی ہے بہر سو یہ شرابی تلوار
فوج پر جب کہ جھپٹتی ہے عقابی تلوار
پہلوانوں کا بدن کانپتا تھراتا ہے
طائرِ روح عدو پنجے میں آجاتا ہے
جب چلی یہ تو کہا تیغ یداللہ نے واہ
پر جبریل پکار اٹھا عیاذاً باللہ
قہر نے بڑھ کے صدا دی کہ نہیں جائے پناہ
موت سائے کی طرح چلتی ہے اسکے ہمراہ
دشمنِ حق کو یہ پیغام فنا دیتی ہے
راستہ نارِ جہنم کا دکھا دیتی ہے
ڈوب کر خون کے دریا میں نہائی تلوار
بن گئی جنگ کے میدان میں حنائی تلوار
پر کفِ دستِ دل آرام کی جائی تلوار
سیکڑوں مر گئے جب ہوش میں آئی تلوار

اپنی جھنکار کو لوری یہ بنا کر پلٹی
موت کی گود میں دشمن کو سلا کر پلٹی

حضرت عباسؑ علمدار کے حوالے سے سارے مرثیہ نگاروں نے اپنا اپنا زور قلم دکھایا ہے جب ہم ثمرؔ صاحب کے یہاں مذکورہ باب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی صلاحیت آفتاب و ماہتاب کی طرح جگمگاتی نظر آتی ہے۔ اس مرثیہ کے دو بند غور کریں ؂

میری بیعت ہے حسن ابن علی کی بیعت
میری بیعت ہے محمدؐ کے وصی کی بیعت
میری بیعت ہے رسولِ عربی کی بیعت
میری بیعت ہے خدائے ازلی کی بیعت
مجھ سے بیعت طلبی ظلم بھی عدوان بھی ہے
مجھ سے بیعت طلبی کفر کا اعلان بھی ہے

پھول سے خار کی بیعت طلبی کیا معنی
خلد سے نار کی بیعت طلبی کیا معنی
دیں سے کفار کی بیعت طلبی کیا معنی
جیت سے ہار کی بیعت طلبی کیا معنی
سر بلند رہِ حق، دار چڑھا کرتے ہیں
نوک نیزہ پہ وہ قرآن پڑھا کرتے ہیں

سر کٹا دے گا لٹا دے گا یہ اپنا گھر بار
نہیں بیعت کے لیے سبط پیمبر تیار
دل میں جو کچھ ہے نکالو وہ عداوت کا غبار
فدیۂ دین خدا ہوں گے عزیز و انصار
زندگی ہے نہ ہمیں راحت و آرام عزیز
بڑھ کے ہے اکبر و عباس سے اسلام عزیز

شمّر ہلّوری کے یہاں آراستگی کا تصور زبان و بیان کو چار چاند لگاتا ہے۔ حضرت عباسؑ کی جاہ و حشمت کی منظر کشی ملاحظہ فرمائیں:

جانب نہر جری مشک و علم لے کے بڑھا
جاہ جعفر کا تو حمزہ کا حشم لے کے بڑھا
ساتھ میں اپنی وفاؤں کا بھرم لیکے بڑھا
گود میں پالے ہوئے بچوں کا غم لے کے بڑھا
غل ہوا بہر قصاص آج یداللہ آئے
تیغ تولے ہوئے وہ حیدر ذیجاہ آئے

یہ ہے تصویر علیؑ حسن و وجاہت دیکھو
ضوفگن ماتھے پہ ہے نقش عبادت دیکھو
حق پرستی کی ادا شان ولایت دیکھو
ضیغمِ حق نظر آتا ہے جلالت دیکھو

وہی تیور ہیں وہی طبع افتاد بھی ہے
اس کے بازو میں وہی زورِ خداداد بھی ہے
انگلیاں وہ ہیں کہ نیزے کی انی ناز کرے
وہ کلائی ہے کہ زور بدنی ناز کرے
ہاتھ کو دیکھ کے شمشیرزنی ناز کرے
سینہ و جسم پہ خود تہمتنی ناز کرے
حسن رفتار پہ ہے رن کی زمین جھومتی ہے
پاؤں ایسے ہیں کہ ثابت قدمی چومتی ہے

ثمر بلّوری کے مرثیہ کا ذکر ہو رہا ہے اس لیے بہتر سمجھتا ہوں کہ اس سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے تاثرات کو یہاں پیش کردوں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس زمانے میں میرا اور ان کا ملنا جلنا کثرت سے تھا اس وقت وہ مرثیے کی طرف (یعنی مرثیہ گوئی کی طرف) زیادہ راغب نہ تھے۔ آہستہ آہستہ انہیں محسوس ہوا کہ ان کا اصل میدان تو مرثیہ ہی ہے اور بقول میر خلیقؔ انہیں اب غزل کو مرثیہ کرنا چاہیئے، چند ہی برسوں میں وہ ہمارے زمانے کے زبردست مرثیہ گویوں میں شمار ہونے لگے افسوس کہ ان کے مراثی کی اشاعت خاطر خواہ نہ ہوسکی۔ ایک بار میں نے اور

مہدیؔ نظمی نے منصوبہ بنایا تھا کہ علامہ ثمرؔ کے منتخب مراثی شائع
ہو جائیں۔ میں نے ثمرؔ مرحوم سے ان کا مرثیہ جناب عباسؑ
اور مرثیہ امام علی رضا اور ایک اور مرثیہ حاصل بھی کرلیا تھا
لیکن مہدیؔ نظمی اچانک اللہ کو پیارے ہوگئے اور وہ منصوبہ
درہم برہم ہوگیا۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ ان مراثی کو اب بھی
شائع کردیتا۔'' (نقشِ جاوداں۔ خورشید ظفر۔ ص۱۰۔۹)

شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کی مرثیہ گوئی سے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ انشاء اللہ جلد ہی ان کے مراثی کا انتخاب شائع ہو جائے گا۔

علامہ ثمرؔ نے ریختی میں بھی طبع آزمائی کی ہے، کلام کی خوبی، زبان کی نزاکت اور نسوانی لب ولہجہ کو جس طرح علامہ نے برتا ہے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کو کس قدر زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ حالانکہ یہ انداز ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ مگر اس میں بھی ان کی قادرالکلامی کسی مستند ریختی گو شاعر سے کم نہیں محسوس ہوتی۔ شاعر بھی انسان ہے اور اس کی طبعیت کبھی کبھی پابندیوں سے بغاوت کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائے سخن قسم کے سنجیدہ شعراء کے یہاں بھی ایسے اشعار ملیں گے جن کو پڑھ کر ذہن ان کے تخلیق کار کا نام سن کر سناٹے میں آجاتا ہے مگر یہ بات ثمرؔ صاحب کے لیے نہیں کہی جاسکتی۔ ان کی ریختی کی شاعری بہت سے بہت اپنے نام کی مناسبت

کی وجہ سے تو 'سوال' ہو سکتی ہے اس کے علاوہ ان کے اوپر کوئی سوالیہ نشان نہیں لگایا جا سکتا کہ انہوں نے اس افتادہ صنف میں شعر کہے۔ ان کے اس طرز کے کلام کو پڑھ کر سوائے اس کے کہ ان کی توصیف کی جائے کہ کس طرح وہ عورتوں کی بامحاورہ زبان بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ مگر اس میں بھی رکاکت اور ابتذال نہیں ملے گا۔

ریختی کے علاوہ انہوں نے ایک ایسی صنف میں بھی شعر کہے ہیں جس کا نام ہی سن کر لوگ ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں، وہ ہے بھی ایسی ہی بدنام ترین شے یعنی کسی کی ہجو کرنا۔ ہجو کا نام آتے ہی سوداؔ اور ضاحکؔ کے تبادلۂ ہجویات کے ایک 'ملغوبے' کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے اور یہ بدنما ترین قسم کے واقعات کا ایک سلسلہ سا آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، علامہ ثمرؔ بلوری نے کسی کی ذات کو اس کا ہدف نہیں بنایا اور نہ ذاتیات کو موضوعِ سخن قرار دیا۔ اور نہ انہوں نے کسی کی ذات پر کیچڑ اچھالا ہے بلکہ اس صنف سے انہوں نے صحتمندانہ طور پر اصلاح معاشرہ کا کام لیا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں ہجویات کے موضوع کے تحت مختلف بدعنوانیوں پر تنقیدی انداز میں ان کی نظمیں ملیں گی۔ جنہیں پڑھ کر آپ کو ان کا مطمحِ نظر صاف نظر آ جائے گا اور ان کی نیک نیتی کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔ ان میں سے چند کے نام بطور نمونہ حاضر کرتا ہوں جیسے: 'شہرت کے پجاری'، 'ناموس فروش'، 'غدار قوم'، 'اردو کا احتجاج'، 'ریاکار'، 'ابن الوقت'،

'خود پسند شاعر' وغیرہ۔ ان کے علاوہ متعدد مضامین ہیں جن میں انہوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ اصلاح معاشرہ کے لیے بہت کام کی باتیں تحریر کی ہیں۔

ثمؔر صاحب کی شاعری دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، ان کے کلام میں وسعت ایک غیر معمولی کارنامہ ہے، مجھے اردو ادب میں ایسے شاعر خال خال ہی نظر آتے ہیں جو اس قدر اعتماد سے اتنے الگ الگ موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے دکھائی دیں۔ ان کی سخن آرائی کا یہ عالم ہے کہ اردو کی تمام ہیئتوں کے علاوہ وہ جو انہوں نے برتیں ہیں۔ متضاد قسم کے وہ موضوعات انتخاب کیے ہیں جن پر شاعری کے لہجے میں کچھ کہنا مشکل ہی نہیں ایک شاعر کے لیے چیلنج سے کم نہیں ہوتا ہے۔ مگر اس سنگلاخ زمین میں بھی انہوں نے خوش نما گل بوٹے کھلائے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کی مروّجہ تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ چنانچہ غزل، نظم، سلام، قصیدہ، مرثیہ ان تمام ثقہ سنجیدہ اصناف کے علاوہ ہزل، ہجویات اور قطعات، مثنوی، تاریخ گوئی، رباعی اور کہہ مکرنیاں وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کلام دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ ان کو کس قدر مشاہداتِ عالم کا تجربہ تھا۔

آخر میں میں اپنے والد محترم (سید فصاحت حسین رضوی صاحب) کا ذکر کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھوں گا جن کی ثمؔر بلّوری سے شعری و جذباتی وابستگی نے مجھ میں یہ کار انجام دینے کی تحریک پیدا کی۔ والد صاحب کی تعلیم و تربیت نے مجھے اس قابل بنایا کہ ثمؔر بلّوری کی شعری کاوشوں کو ادبی حلقوں تک

پہونچانے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

یہ مجموعہ کلام پایہ تکمیل کو کبھی نہ پہونچتا اگر برادرم خورشید الحسن رضوی خورشید ظفر (پسر ثمر ہلوری مرحوم) کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ ان کا شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے اس مجموعہ کو ترتیب دینے میں بڑی آسانیاں حاصل ہوئیں۔ اس موقع پر میں جناب رباب رشیدی صاحب، جناب علی احمد دانش، جناب مخمور کاکوروی اور ریحان عباس کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے اپنا بھرپور تعاون دیا۔

'ہیرے پتھر' کے نام موسوم یہ گلدستہ 'تخلیقات رنگ رنگ کے پھولوں سے لہک رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہر پھول کی خوشبو مشام جاں کو معطر کرنے والی، ذوق شعری کو جلا بخشنے والی ہے۔ میں اپنی عجز بیانی پر خجل ہوں کہ ثمر ہلوری کے کمالِ فن پر سیر حاصل گفتگو نہ کر سکا۔ بس جستہ جستہ کہیں ادھر سے کہیں ادھر سے کچھ نمونے اپنی بات میں شامل کر لیے۔ ترتیب میں بھی ہم آہنگی کے فقدان کا خاکسار کو شدید احساس ہے۔ مگر یہ اطمینان ضرور ہے کہ اشاعت کے اس کار خیر میں تھوڑے تعاون کی سعادت مجھے اللہ نے عطا فرمائی ہے۔ اصل مقصد ہے کہ اس مجموعہ کلام کا منظر عام پر آنا۔ جو ادب میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھے گا۔ نیز جس کے اشعار سے آنے والی نسلیں زبان کی سند حاصل کریں گی۔ میں یہیں پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔

سید وضاحت حسین رضوی

باسمہٖ سبحانہٗ

آفریدگارا !

یہ آسماں ازل کی جو قدیم یادگار ہے
عروسِ روز و شب سے ہر قدم پہ ہمکنار ہے

نفس کی میتیں فنا کے دوش پر رواں دواں
زمیں کی گود حادثاتِ دہر کا مزار ہے

ہوائیں کروٹیں بدل رہی ہیں کائنات میں
بہر نفس اک انقلابِ تازہ کی پکار ہے

شمیمِ زلفِ کفر ظلمتوں کی شکل میں عیاں
جہاں فروزِ ماہ و آفتابِ نور بار ہے

کہیں یہ دشت ہے کہیں چمن کہیں یہ شہر ہیں
کہیں یہ مرغزار اور کہیں یہ کوہسار ہے

بقدرِ ظرفِ شوق ہیں ترقیاں جہان میں
کہیں یہ بحرِ بیکراں کہیں یہ جوئبار ہے

زمیں کے سینے میں نہاں رموزِ دولتِ جہاں
یہ سازِ دورِ آسماں زماں کو سازگار ہے

سرودِ انجم و ملک یہ سازِ گردشِ فلک
جمالِ طور کی جھلک بہار در بہار ہے

زباں پہ کائنات کی ہر ایک شے کے دمبدم
بہ فیضِ نعمتِ وجود حمدِ کردگار ہے

حریمِ کُن میں تا حدِ تصورِ حدوث یوں
خدائے دو جہاں کی شانِ قدرت آشکار ہے

اُسی کے فیض سے خیال و ہوش کی ہے پرورش
حدودِ جبر میں بشر کا ذوقِ اختیار ہے

نمود کی عنائتیں وجود کی لطافتیں
نمود مستعار ہے وجود مستعار ہے

۱۹۴۲ء

استقبالیہ

بہ بارگاہ رسالت پناہ

خوش آمدید شاہدِ رنگین و بے نقاب — خوش آمدید انجمن آرائے شیخ و شاب

خوش آمدید سلطنت آرائے ملکِ زیست — خوش آمدید حاملِ انوار خاکتاب

خوش آمدید نازشِ تخلیقِ کائنات — خوش آمدید مایۂ تعریفِ انقلاب

خوش آمدید مرکزِ عشقِ کلیمِ طور — خوش آمدید جلوہ گرِ پردۂ خطاب

خوش آمدید نورِ جبینِ خلیلؑ و نوحؑ — خوش آمدید پرتوِ خالق حق انتساب

خوش آمدید افضلِ خلق افتخارِ خلق — خوش آمدید عظمتِ آدمؑ فلک جناب

خوش آمدید فخرِ سلیمانِ کائنات — خوش آمدید نازشِ عیسیٰؑ سما رکاب

خوش آمدید نورِ جمالِ ازل کہ بود — در سِرِّ کُن صورتِ حق محرمِ حجاب

خوش آمدید حسن و جمالِ محمدیؐ — نورِ ازل امینِ رسالت بصد شباب

ذاتِ گرامی افضلِ خلقت لقب گرفت — ذاتِ گرامی اوّلُ مَا خلق در خطاب

او نورِ حسن داد بہ یوسفؑ جبیں کہ چوں — مہ را دہد ز کتمِ عدم نورِ آفتاب

آں فخرِ کائنات رسولِ خدا کہ ہست — در عالمِ رموزِ کُن اُستادِ بو ترابؑ

کرسی و لوح و عرش و قلم از وجودِ پاک — در حلقۂ شہود گرفتند انتساب

اے برگزیدہ ذاتِ رسولِ خدائے خلق
عشقِ شما بہ قلبِ نمرؔ وجہِ اضطراب

۱۹۶۲ء

منزل معراج

انساں پہ وا ہوتے ہیں افلاک کے در آج — اک باب نیا کھول دے تاریخ بشر آج

تا عرشِ الٰہی کسی انساں کی رسائی — اب تک نہیں ممکن تھی یہ تسلیم، مگر، آج

حیرت سے فرشتے بھی کھڑے دیکھ رہے ہیں — بدلا ہوا انداز قضا رنگِ قدر آج

اب حسن ہے بیتاب پسِ پردہ پئے عشق — کل تک جو ادھر تھی ہے وہی بات اُدھر آج

سدرہ سے بہت دور بہت دور بہت دور — اک برق جمال آتی ہے اسوقت نظر آج

خود رہبر و خود راہی و خود شمعِ سرِ راہ — انداز میں اپنے یہ نرالا ہے سفر آج

آؤ مرے محبوب ذرا اور قریب آؤ — اعلان محبت ہے یہ اندازِ دگر آج

اللہ کو بھی لطفِ تکلم کی ہے خواہش — ہے سامنے نظروں کے جو منظورِ نظر آج

توسین کی خلوت کے مزے اور ہی کچھ ہیں — محبوب خدا کو ہو مبارک یہ سفر آج

پردے کے اِدھر عشق کا قرآن کھلا ہے — اور حسن کی تفسیر ہے پردے کے اُدھر آج

خالق متکلم ہے مخاطب ہیں پیمبر — غائب ہے تکلف نہیں غیروں کا گذر آج

یہ آپ کی تقدیر ہے یہ آپ کی قسمت
چلتے ہیں قمر آپ بھی مدحت کے گھر آج

۱۹۶۴ء

ابو تراب ؑ کے حضور میں

اے علیؑ اے جانشینِ سیدِ گردوں حشم
کعبہ محراب و منبر قبلہ سیف و قلم

جانِ ختم المرسلیںؐ اسلام کا پہلا شباب
فرشِ پیغمبرؐ پہ احمدؐ بو رئیے پہ بوترابؑ

یہ شبِ ہجرت شبِ معراج سے ہم پہ کھلا
تو مثیلِ مصطفٰےؐ ہے تو مثالِ کبریا

بن کے تحفہ آیا گر قرآں پیمبرؐ کے لئے
ذوالفقار اللہ نے بھیجی ہے تیرے واسطے

اے علیؑ ابنِ ابی طالبؑ فریدِ روزگار
خواجۂ جبریلؑ نفسِ مصطفٰےؐ دلدل سوار

جنگ کے میداں میں حیدرؑ اور گھر میں بوالحسنؑ
بزم میں جانِ فصاحت رزم میں شمشیر زن

کاسرِ اصنام کعبہ میں بدوشِ مصطفٰےؐ
کُل ایماں غالبِ کُل کفر جانِ اتّقا

باغ میں مزدور بیت المال میں سلطانِ وقت
یعنی ہر ماحول میں تو جانِ وقت ایمانِ وقت

گہہ علیؑ گہہ مرتضٰیؑ گہہ مظہرِ شانِ خدا
جلوۂ صد رنگ تیرا اک معمّہ بن گیا

تو امامِ اہلِ ایماں ربِّ اربابِ شہود
تجھ پہ تیری آل پہ خالق نے بھیجا ہے درود

ساقیٔ کوثر قسیمِ نار و جنّت شاہِ دیں
مظہرِ عین الیقین و مصدرِ حق الیقیں

ایک چٹیل دشت کی تپتی ہوئی وہ دوپہر
شاہدِ عینی بنی تیرے فروغِ ذات پر

ذرّے ذرّے سے صدائے مرحبا آنے لگی
جامِ عرفاں میں مئے توحید لہرانے لگی

ذرہ ذرہ بوترابی ہے یقیناً دلیل
ذات تیری جادۂ امکاں میں ہے اک سنگِ میل

واقفِ اسرار و رمزِ آیۂ انّ الملوک
تجھ سے ہو سکتی نہیں کارِ جہانبانی میں چوک

باعثِ اتمامِ نعمت، باعثِ اکمالِ دیں
وجہِ عرفانِ خدا، بازوئے ختم المرسلینؐ

تیرا اعلانِ خلافت ہے بہ اندازِ فصیح
آیۂ اکملتُ ہے اس قول پر نصِ صریح

اے ولیِ حق وصیؐ سرورِ گردوں رکاب
تو محمدؐ بھی علیؑ بھی ہے پسِ ختمی مآب

(۱۹۶۶ء)

قربانی

اہلِ ایماں کیسے گذریں جادۂ تسلیم سے
درس یہ ملتا ہے ہم کو عزمِ ابراہیمؑ سے

ہے رضائے خالقِ اکبر اگر مطلوبِ دل
جذبۂ ایثار و قربانی بنے منسوبِ دل

حسنِ معیارِ عمل مومن کی ہستی بن گئی
فکرِ قربانی دلیلِ حق پرستی بن گئی

بارگاہِ حق میں قربانی بہت مقبول ہے
ملتِ اسلامیہ کا آج یہ معمول ہے

ہے پسند اللہ کو معیارِ عرفانی بھی ہے
دین کے اجزاءِ ترکیبی میں قربانی بھی ہے

خوابِ ابراہیم کی سچائی ایثارِ ذبیح
منزلِ آغازِ صبر و شکر ہے کارِ ذبیح

غور سے دیکھ اے مسلماں اسوۂ سبطِ رسولؐ
نقطۂ معراجِ قربانی ہے فرزندِ بتولؐ

عیدِ قرباں یادگارِ کارِ ابراہیمؑ ہے
ذوقِ قربانی کی یہ اک مستقل تنظیم ہے

اے مسلماں اُٹھ حسینؑ ابنِ علیؑ کے نام پہ
کرلے قبضہ جان دیکر گردشِ ایام پہ

(۱۹۶۶ء)

مشکوٰۃ

نذرِ بتولؑ بنتِ فخر المرسلینؐ

حُسن افزائے زمانہ ہے زہے شانِ حجاب
باغِ عالم ہے کہ پائیں باغِ ایوانِ حجاب

سیدہ بنتِ رسولؐ دو جہاں کا نور ہے
مثل نورِ ذوالمنن شمعِ شبستانِ حجاب

ہر عمل عصمت بدامن ہر قدم درسِ حیا
عصمت خیر النساءؑ ہے یا کہ قرآنِ حجاب

آپ ہی سے طبقۂ نسواں میں ہے حُسنِ عمل
آپ ہیں پیغمبرِ آئینِ نسوانِ حجاب

حسنِ معنیٰ جامۂ الفاظ میں روپوش ہے
کیا ادب آموزِ عالم ہے دبستانِ حجاب

اوڑھ کر نکلیں ردا جب بھی بپٹے اعلانِ حق
بن گئی زہراؑ کی ہستی عینِ میزانِ حجاب

بن گئی ضرب المثل اہلِ حیا کے واسطے
دخترِ پیغمبرِ اسلام کی شانِ حجاب

آپ کی چادر کے ہر پیوند کا صدقہ ہے یہ
اک زمانہ آج بھی ہے زیرِ فرمانِ حجاب

وہ خدیجہؑ کا عمل ہو یا ہو زہراؑ کا عمل
دینِ پیغمبر پہ ہے تا حشر احسانِ حجاب

کہہ رہی ہے عصمت خیر النساءؑ کی معرفت ق
غیب پر ایمان لانا بھی ہے ایمانِ حجاب

شیرِ زہراؑ سے جدا ظاہر ہوئیں تاثیریں تین
اصل سب کی ایک ہے لیکن بعنوانِ حجاب

ایک ہے خُلقِ حسنؑ اور دوسری عزمِ حسینؑ
تیسری کلثومؑ و زینبؑ کا ہے عرفانِ حجاب

قوم کی بے پردگی پہ رو رہے ہیں یا بتولؑ
آپ کے خادم کہ جو ہیں دردمندانِ حجاب

اے شمیمؔ خدمتگزاری ہے بہت سلمانؓ کی
حضرتِ سلمانؓ ہیں دربانِ ایوانِ حجاب

۱۹۵۹ء

تذکرۂ حسنؑ

سیاست کذب کی بیٹی ہے مکر و زور کی ماں ہے — اسی لعنت کی ماری مستقل اک نسلِ انساں ہے

غرض کے واسطے ہر رنگ جائز ہے زمانے میں — وہ ہے سیّاس جو اس ڈھنگ سے واقف ہر آں ہے

کبھی مانند صوفی بے نیاز ضبط اسلامی — کبھی واعظ کی صورت بر سر منبر گل افشاں ہے

یہ مرد فتنہ پرور ننگ ملت ننگ دیں ہو کر — بباطن دشمن اسلام ظاہر میں مسلماں ہے

سیاست ایک ذریعہ ہے حصولِ جاہ و منصب کا — یہ مذہب کُش ہے دنیا کوش مقصد کی رگ جاں ہے

یہ اک آماجگاہ جذبۂ تلبیس ہے ہمدم — یہ حیلہ سازیوں کی درسگاہ فتنہ ساماں ہے

کبھی اپنی روایت کی پرستش کے بہانے سے — وقارِ مذہبِ اسلام پہ حملے کا اعلاں ہے

یہ جو فتنے اٹھائے جا رہے ہیں دہر میں ہر دم — جواب اس کا حیاتِ سبطِ سلطانِ رسولاں ہے

نبیؐ کے بعد ہے یہ وارثِ فتح مبیں تنہا — یہ ملکِ صلح کا بعد رسول اللہؐ سلطاں ہے

نیامِ حلم میں ہے بند تیغ مصلحت جس کی — سمندِ عزم جس کا عرصۂ حکمت میں جولاں ہے

نہیں تلوار سے اسلام پھیلانے کا جو قائل — کہ جس کا خُلق جنگ ملک گیری سے گریزاں ہے

بنی آدمؑ کو جس نے صلح کی راہیں دکھائی ہیں — حسنؑ ابن علیؑ وہ رہنمائے نوعِ انساں ہے

ہوئی ہے انتہا رسم خلیلؑ اللہ کی ان پہ — کہ دسترخوان ان کا مظہرِ توقیرِ مہماں ہے

کوئی ہمسر بجز شبیرؑ ان کا ہو نہیں سکتا

نبیؐ نانا۔ ولی بابا۔ تو بانوئے ارم ماں ہے

۱۹۷۵ء

زندۂ جاوید

آدمؑ کا اعتبارِ شرافت حسینؑ ہیں
روشن ترین آیۂ قدرت حسینؑ ہیں

جانِ ذبیح وجہ سکونِ دلِ خلیلؑ
ذبحِ عظیم صاحبِ عظمت حسینؑ ہیں

نوحؑ سفینۂ بشری باعثِ نجات
پرچم کشائے کشورِ وحدت حسینؑ ہیں

عیسیٰؑ کی روح ضربِ کلیمِ خدا ہیں یہ
عزم و عمل کی دہر میں صورت حسینؑ ہیں

"مجھ سے مرا حسینؑ ہے میں ہوں حسینؑ سے"
قولِ نبیؐ کی مہرِ صداقت حسینؑ ہیں

ہو کر شہید زندۂ جاوید ہیں حسینؑ
یا یوں کہوں ثبوتِ رسالت حسینؑ ہیں

پروانۂ نجات ہے دامن حسینؑ کا
بخشش کی روزِ حشر ضمانت حسینؑ ہیں

ہے فرض جس کا ماننا از روئے دینِ حق
عالم میں وہ نبیؐ کی وصیت حسینؑ ہیں

اسلام اب انھیں کا اور اسلام کے ہیں یہ
تاریخ سازِ مذہب و ملّت حسینؑ ہیں

آہن کو موم سنگ کو شیشہ بنا دیا
آیا سمجھ میں! واقفِ فطرت حسینؑ ہیں

بیعت نہ کی کٹا دیا راہِ خدا میں سر
غارت گرِ غرورِ حکومت حسینؑ ہیں

خنجر شکن گلوں نے بتایا جہان کو
فتحِ مبینِ حق کی حقیقت حسینؑ ہیں

راہِ خدا میں اپنا بھرا گھر لٹا دیا
اسلام کے وقار کی دولت حسینؑ ہیں

روئے ہیں جس پہ جن و ملک آسمان زمین
وہ بیکسی کا پیکرِ عصمت حسینؑ ہیں

ہر دور میں جو قابلِ تقلید ہے ثمرؔ
انسانیت کی ایسی روایت حسینؑ ہیں

۱۹۶۱ء

جشنِ آزادی

صدائے روشنی و نغمہ ہائے مست آئی زہے نصیب کہ صبحِ خوشی بدست آئی

مٹاتی ملک سے فرقِ بلند و پست آئی ہوا یہ شور کہ پھر پندرہ اگست آئی

خدا کا شکر در و بام و سقف سجنے لگے

یہ نوبت آئی کہ پھر شادیانے بجنے لگے

کفن بدوش سپاہی کی یادگار ہے یہ رہِ حیات کے راہی کی یادگار ہے یہ

کسی اسد کی جماہی کی یادگار ہے یہ زوالِ افسرِ شاہی کی یادگار ہے یہ

ملوک اپنے غرورِ دنی مزاج کے ساتھ

اُلٹ چکے ہیں روایاتِ تخت و تاج کے ساتھ

چھڑا وہ نغمۂ چنگ و رباب آزادی سکوں کی گود میں ہے اضطراب آزادی

سحر طراز ہے حسن و شباب آزادی نہ مل سکے گا کہیں بھی جواب آزادی

اندھیرے ذہن کو نورِ حیات دیتی ہے

بقیدِ ظرف شعورِ حیات دیتی ہے

نظر جو آئے بہر سو سکوں کے آئینے ملائی بھائی سے خوش ہو کے آنکھ بھائی نے

قدم لئے ہیں جو پسماندوں کے بڑائی نے سلیقہ پایا سفر کا شکستہ پائی نے

رہِ وجود میں روشن ہیں زندگی کے چراغ

جلائے جائیں نہ کیوں جھونپڑوں میں گھی کے چراغ

خوشا کہ باغ میں پیغمبرِ بہار آیا — گلوں کی زندگیٔ آرزو سنوار آیا

دلوں کو چین ملا روح کو قرار آیا — نویدِ زیست لئے کوئی قربِ دار آیا

غموں کی فوج پڑی کوچۂ ممات میں ہے

وجود صرف مسرت کا کائنات میں ہے

چمک رہا ہے وہ سورج لہو کی لالی کا — ہے دلنواز یہ نظارہ خوش مآلی کا

زمانہ آگیا تہذیب کی بحالی کا — ہوا علاج ہماری شکستہ حالی کا

برائے زخمِ جگر یہ نویدِ صحت ہے

ہمارے ہاتھ میں پروانۂ حکومت ہے

نویدِ صبحِ تمنا ہے یا مسیحِ بدن — رگِ حیات بنا جا رہا ہے تارِ کفن

وہ مقبروں سے اٹھے خفتگانِ خاکِ وطن — بگولے اُٹھے جنم لیکے قربِ گنگ و جمن

نصیب وادیٔ مشرق میں رات کے پھوٹے

صلیب و دار سے چشمے حیات کے پھوٹے

اُٹھو کہ نغمۂ نو چھیڑنے لگے نئے ساز — چلو کہ شہرِ وفا میں ہے امن عشق طراز

ہے آج حسن کی محفل کا اور ہی انداز — غزل سناؤ زمانہ ہے گوش بر آواز

رہِ حیات کے درماندوں کا علاج کرو

بنامِ امن زمانے کو ہم مزاج کرو

۱۹۵۸ء

سچائی کی زبان

(رمزیہ)

(۱)

دل کی آواز ہے یہ وقت کے ماروں کے لئے
روشنی لایا ہوں ٹوٹے ہوئے تاروں کے لئے

منتظر آج بھی ہے محملِ لیلائے حیات
میری بیتاب نگاہوں کے اشاروں کے لئے

جستجو مرکزِ اُمید کی باقی ہے ابھی
مضطرب موج ہے دریا کی کناروں کے لئے

بے عمل بے خبرِ سود و زیانِ ہستی
وقف ہے جوشِ عمل قوم کا یاروں کے لئے

گردنیں اُٹھتی ہیں بس شورِ انا کی خاطر
کوئی گردن نہیں تلوار کی دھاروں کے لئے

قید افکار و خرد اور ہے مفلوج دماغ
آہوئے دشت ترستا ہے طراروں کے لئے

ماضیٔ قوم کا قصہ ہے زبانوں پہ مگر
شعلۂ خفتہ ہے محتاج شراروں کے لئے

(۲)

محفلِ عیش سے جب ہو کے پشیماں نکلا
کوئی ہمدرد زمانے میں نہ انساں نکلا

صورتِ نکہتِ گل یہ دلِ آشفتہ سرشت
چھوڑ کر صحنِ چمن چاک گریباں نکلا

راس آیا نہ خرد زار عمل کا ماحول
رم صحرائے جنوں خواب بیاباں نکلا

طلبِ اجرِ عمل وقت کے آقاؤں سے
باغبانِ چمنِ شوق بھی رضواں نکلا!

کلمہ گوئی کے یہ دعوے تھے زبانی شاید
ہم سے سر بر سرِ رہ راہبِ نجراں نکلا

ایک تکمیلِ ہوس پر ہمیں کہنا ہی پڑا
دل میں محصور جو تھا آج وہ ارمان نکلا

داغِ ناکامیٔ دِل ہم سے مٹایا نہ گیا
"قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا"

(۳)

گفتگو چرب زبانی کے سوا کچھ بھی نہیں
فرِ تیمور کیانی کے سوا کچھ بھی نہیں

جوشِ محرومِ عمل، اصل میں تحریک مزاج
صرف ٹھہرے ہوئے پانی کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ تنک ظرفیٔ ملّت کی صدائے مہمل
ماتمِ عہدِ جوانی کے سوا کچھ بھی نہیں

منبرِ وعظ پہ آواز کے مستوں کا ہجوم
شوقِ آشفتہ بیانی کے سوا کچھ بھی نہیں

بر لبِ کرب کی ہر چیخ بشکلِ نغمہ
خلشِ دردِ نہانی کے سوا کچھ بھی نہیں

خوگرِ رنگِ بیاں ہے جو یہ نقشِ ہستی
جنبشِ خامۂ مانی کے سوا کچھ بھی نہیں

قومِ مرحوم کی تعمیرِ لحد کا چرچا
قصّۂ قصرِ کیانی کے سوا کچھ بھی نہیں

(۴)

لافِ تمکیں سرِ بزم اور طرحداروں سے
ذکرِ شیرینیٔ مے خوب ہے میخواروں سے

محبسِ وہم ہے بے در کوئی کیونکر نکلے
کام دروازوں کا بنتا نہیں دیواروں سے

دلِ آزاد کو پابندیٔ زنداں سے گریز
آشنا کان ہیں زنجیر کی جھنکاروں سے

چھیڑ دو نغمۂ بے سازِ غمِ دوراں کا
کام لینا ہو تو ابت کا جو سیّاروں سے

نشۂ بادۂ دولت میں یزیدانِ جدید
سج کے آتے ہیں اگر ظلم کے ہتھیاروں سے

اُٹھتے ہیں اپنے مصلّوں سے خدا کے بندے
لڑتے ہیں حق کے لئے ڈٹ کے ستمگاروں سے

مردِ میداں جو ہیں وہ حُرِّ دلاور کی طرح
کام لے لیتے ہیں ٹوٹی ہوئی تلواروں سے

۱۹۷۱ء

سخن ہائے گفتنی

(۱)

السّلام ابنائے ملّت نازِ برداران قوم — تم سے قائم کائنات دہر میں ہے شانِ قوم

جو تمہارے خون کے گارے کی اک تعمیر ہے — منہدم ہونے کو ہے صد حیف وہ ایوانِ قوم

وقت ہے ناسازگار اور زندگی ہے بے عمل — ہو گئے عضوِ معطل کار پردازانِ قوم

فی سبیل اللہ کوئی کام اب ہوتا نہیں — یعنی ہے کمزور تر پہلے سے بھی ایمانِ قوم

اسوۂ ہستیٔ آلِ مصطفٰے سے انحراف — اے معاذاللہ یہ بدبختیٔ اعیانِ قوم

قوم کی بدحالئ و بربادئ و ادبار کے — خود ہی ذمہ دار ہیں ہم سب غرض مندانِ قوم

"بوئے عشقی نیست پیدا عشق بازاں را چہ شد"

"شیر مرداں را چہ آمد سرفرازاں را چہ شد"

(۲)

ہوشیار اے اسوۂ آئمہ کے سرمایہ دار — تنگنائے وقت کی تاریکیوں سے ہوشیار

کہنے والا کہہ گیا تعلیم کے انداز میں — لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

اب بھی پا سکتا ہے تو بحرِ ہلاکت سے نجات — دیکھ اپنی قوت مستور اپنا حالِ زار

مردِ مومن اور یہ تجدیدِ رسمِ ارتداد — کفر ہے یعنی جہادِ زندگانی سے فرار

سعیٔ پیہم موجب تحصیل مقصودِ حیات — سعیٔ پیہم گلستانِ زندگی کی ہے بہار

لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی[1] پر غور کر — یہ وہ نکتہ ہے جو سمجھایا گیا ہے بار بار

ہے تعمّق شرطِ ایمان و عمل کی ایک بات — کہہ گیا پیغمبرِ اُمّی بعنوانِ ہزار

[1] فقرۂ قرآنی

رہنمائے زندگی آئین قرآن و حدیث   وارثِ تختِ پیمبرؐ بادشاہِ پردہ دار

پردۂ غیبت میں نگرانِ عمل موجود ہے

نامۂ اعمال پیشِ مہدیؑ موعود ہے

(۳)

کتنا ہیبت ناک ہے تنظیم ملّت کا سوال   سخت مشکل ہے کسی ناسورِ غم کا اندمال

لیکن اس اُمید پر قائم ہے دنیا بالیقیں   ہر کمالے را زوال و ہر زوالے را کمال

کوششِ پیہم کو حاصل ہوتی ہے تائیدِ غیب   لامحالہ سعئی کامل ہوتی ہے فرخندہ فال

دوڑ دھوپ اس عرصۂ ہستی میں ہم پر فرض ہے   موت کا بیّن سبب ہے صرف زہرِ قیل و قال

ڈھونڈ لیتی ہے عمل کی سیکڑوں راہیں وہی   علم سے جو قوم ہو جاتی ہے پہلے مالا مال

جل رہا ہے گلشنِ ملّت حسد کی آگ سے   یہ جہالت حیف بغضِ باہمی کا یہ مآل

فرد سے قائم ہے ملّت فرد کی تخصیص سے   چشم پوشی مسلکِ تنظیمِ ملت میں محال

جھوٹی عزّت جھوٹی شہرت کے لئے کچھ بدتمیز   تفرقہ اندازِ ملّت ہیں ذلیل و بدخصال

یہ منافق بھیس میں مصلح کے آتے ہیں نظر   بزمِ شوریٰ میں عموماً مجلسوں میں خال خال

ہوشیار اے پیروانِ اہلبیتِؑ مصطفٰےؐ   انتخابِ رہبرِ ملّت ہے اک ٹیڑھا سوال

صاحبانِ علم و حلم و جرأت و ہمّت کے ساتھ

آؤ میدانِ عمل میں جذبۂ خدمت کے ساتھ

۱۹۶۲ء

چاند

یہ چاند نور کا اک مرکزِ حسین و جمیل
فلک کے صحن میں روشن ہے یا کوئی قندیل

اسے سمجھتے ہیں ہم مہر کا رخانۂ شب
نہیں جو یہ تو ادارے میں ہے کوئی تعطیل

رواں دواں ہے بہ امداد بادبانِ وقت
پلاٹینم کی یہ کشتی بر روئے رودِ نیل

اسے خبر ہے صنادیدِ دہر کی کہ جو تھے
ہر انقلاب زمانہ کے سرپرست و کفیل

وجود اسکا ہے کشاف رازہائے دروں
نہ کوئی دعویٰ کی حاجت نہ احتیاجِ دلیل

یہ دورِ سنگ کا ہمراز انیس شیشہ گراں
سمجھئے اسکو رہِ ارتقا کا سنگِ میل

یہ چاند محرمِ حسنِ سکوت ہے کہ کہیں
خموشیٔ لبِ خوباں کا بے مثال وکیل

یہ سحر ہے کہ نظر بندیٔ لبِ فطرت
سمٹ کے بن گئی ہے چاند روشنی کی جھیل

دلِ سکوت پسند قمر میں ہیں پنہاں
فسانہ ہائے زمن جنکو کہئے بالتفصیل

نہ جانے کتنے علائم کی یہ علامت ہے
یہی ہے محرمِ دورِ حیاتِ اسرائیل

اُٹھالے ذوقِ ترقیٔ آدمِ خاکی
لٹک رہی ہے سرِ سقفِ آسماں قندیل

کُند شمارِ شب و روز و ماہ و سال از ہیں
بہ نصِ آیۂ قرآں گروہ اسماعیل[1]

ترے وجود نے اے چاند زندگی کی طرح
اندھیری رات میں ڈالی ہے روشنی کی طرح

سنہ ۱۹۷۰

[1] آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔

مسلمانوں سے خطاب

اے مسلم بدحال و سراسیمہ و دل تنگ
کچھ اور ہی کہتا ہے زمانے کا نیا رنگ

تو اور سراسیمگی و پست خیالی
آج عالم اسباب تجھے دیکھ کے ہے دنگ

سن اور سمجھ فلسفۂ عالم ہستی
مرجاتا ہے آتا نہیں جینے کا جسے ڈھنگ

اسباب فراہم ہوں تو آسان ہے جینا
اسباب نہ ہوں گر تو حیات بشری تنگ

ہر خوگر پرواز کی سرحد میں فلک ہے
جو کسل کا عادی ہے وہ ہے طائرِ ازرنگ

مقصد کی بلندی کا پتہ دیگی بہر حال
وہ صلح حسنؑ ہو کہ نبیؐ زادے کی ہو جنگ

توحید کا فرزند صنم زاد نہیں ہے
خود اسکا پرستار ہے یہ عالم صد رنگ

کانپا ہے تن مذہب اسلام کا ہر بند
یہ سن کے کہ محکوم مسلمان ہے دل تنگ

محنت کے مشقت کے ہیں قبضہ میں کل اسباب
جینے کے لئے قوت کونین سے کر جنگ

اے عبد رسولؐ عربی بندۂ حیدرؓ
ٹھوکر میں تری تاج شہنشاہی و اورنگ

تربیت کردار سے چمکے گا ترا نام
صیقل شدہ آہن میں کبھی لگتا نہیں زنگ

معراج رسولؐ عربی اس کی ہے شاہد
لمحات کے ہے زیر قدم دوریٔ فرسنگ

پھر قوم کو ہے عزم حسینیؑ کی ضرورت
دامان عمل مرد مجاہد کا نہیں تنگ

ممکن ہے ترا نعرۂ تکبیر کسی روز
ہو جائے صدائے دل حیدرؓ سے ہم آہنگ

کیف آور و پُر جوش تھی صہبائے ولایت
اس مے میں ملائی نہ ہو واعظ نے کہیں بھنگ

۱۹۶۱ء

زندگی

دن کے جلوؤں میں بہر سو ضو فشاں ہے زندگی
رات کی تاریکیوں میں بھی نہاں ہے زندگی

مُسکراتے پھول کی نس میں رواں ہے زندگی
اور کمھلائی کلی پر نوحہ خواں ہے زندگی

حسن کی رنگینیوں میں شادماں ہے زندگی
عشق کی صورت میں بھی گریہ کناں ہے زندگی

خار و خس کی شکل میں گر آشیاں ہے زندگی
بھیس بدلے برق کا شعلہ فشاں ہے زندگی

ہر شئے موجود کا راز نہاں ہے زندگی
گاہ پابندِ مکاں گہہ لامکاں ہے زندگی

۱۹۳۹ء

کون انسان بزرگ ہے

ایک دن مجھکو قلندر نے بتائی گُر کی بات
جرم ہے تفریقِ ملت ہیچ ہے یہ ذات پات

کیوں کسی انساں کو ہے اپنے سے نیچا جانتا
کیا سبب ہے کیوں نہیں بھائی کو تو پہچانتا

کون سا ہے فلسفہ جس نے بدل ڈالا دماغ
کر دیا ہے قصرِ انسانی کا جس نے گل چراغ

یاد رکھ اے صاحبِ ہوش و خرد تو یاد رکھ
زندگی کا تیری مقصد ہے کہ سبکو شاد رکھ

پیکرِ خاکی کے ہر پُتلے کا رُتبہ ایک ہے
حق کی نظروں میں بڑا وہ ہے جو بندہ نیک ہے

۱۹۳۹ء

یادِ آرزو[1]

اے امامِ شاعری اے آرزو شاہِ غزل
آ گئی کیسی یہ تجھکو آہ بے موقع اجل

تو ریاضِ شاعری کا گو کہ سوکھا پھول تھا
پھر بھی پژمردہ ترا ہونا گیا ہم سب کو کھل

رویاں رویاں تھرتھرا جاتا ہے تیری یاد سے
بے ارادہ آنکھ سے آنسو بھی آتے ہیں نکل

ہر گھڑی جو کرب کا احساس رہتا ہے مجھے
لاکھ کچھ کیجے نکلتا ہی نہیں ہے اسکا حل

ہر ادیب و شاعر و ناقد و اہلِ ذوق کو
ایک ساعت تیرے مرنے سے نہیں پڑتی ہے کل

اے کہ تو تھا شاعری کے سیپ کا دُرِّ یتیم
پا نہیں سکتا ہے اقلیمِ سخن تیرا بدل

وزن میں ہر قافیہ میں بحر میں تو طاق تھا
بحرِ متقارب ہو یا بحرِ رَجز یا ہو رَمَل

اے کہ تو سورج سخن کے آسماں کا بالیقیں
محسنِ اُردو ادب اے رہبرِ راہِ غزل

ڈوبنے کے وقت بھی اے آفتابِ پُر شکوہ
تیری لالی سے پڑے تھے نور کے چشمے اُبل

مستند تیری زباں تیرے بیاں میں ہے مٹھاس
تیری تشبیہیں اچھوتی اور کنائے با محل

ہے فصاحت اور بلاغت دونوں تیرے شعر میں
لفظ جو رکھا جہاں پر وہ وہاں پر ہے اٹل

تیرے طرزِ خاص کی تعریف ہو سکتی نہیں
تیری اُردو خالص ویسے مثل پیاری بے بدل

ہے تمنؔر کی یہ دعا صدقے میں آلِ پاک کے
دامنِ رحمت میں لے تجھکو خدائے عزّ جل

۱۹۵۱ء

[1] علامہ آرزو لکھنوی کی موت سے متاثر ہو کر۔

رقصِ آواز[1]

یک نفسِ تازہ دَم جس کیلئے ہر قدم کرتی رہیں سب اُمم کاوشِ گردوں شگاف
اپنا وجود و عدم قانعِ باغِ ارم، پست ہماری ہمم، رکھتے ہیں ہم اختلاف

حالِ غمِ دل نہ پوچھ، جلوتِ محفل نہ پوچھ، دوریٔ منزل نہ پوچھ قافلہ اپنا رکا
قاتلِ بسمل نہ پوچھ، عقل ہے زائل نہ پوچھ بے حسی کامل نہ پوچھ، کچھ نہیں اپنا پتا

عالمِ ناپائدار، زشت خو و بد شعار، تو فقط اس سے دوچار بھول کر اپنا چلن
زندگی بے اعتبار، تیری خزاں ہے بہار، جیت سمجھ اپنی ہار، حاملِ رنج و محن

ذوقِ نظر ہو اگر، قلب و جگر ہو اگر، فکر بہ سر ہو اگر، اپنی بضاعت کو جان
علم و ہنر ہو اگر، عقلِ بشر ہو اگر، دل کی نظر ہو اگر، اپنی حقیقت کو جان

اپنے عمل سے جگا، اپنی خودی سے سکھا، اپنے یقیں سے بتا، منزلِ انسانیت
اے ثمرِ باخدا، صاحبِ عشق و ولا، نارگلِ جانفزا، ہیچ ہے نمرودیت

۱۹۴۸ء

خود بینی

فریبِ ذہنِ بشر ہے دلیلِ بے بصری — نوائے طفل و بنجر کی بازگشت ہے یہ
ہے مرگِ جوہرِ انسانیت یہ خود بینی — کہ خود شناسی کے جذبات کی شکست ہے یہ

۱۹۴۸ء

[1] شاعرانہ زندگی کی تیسری نظم

جمہوریہ

یہ بات ہے سچ یا کہ غلط کہہ نہیں سکتا
سنتا ہوں جنم اپنے ہی کرموں کا ہے فرزند

گر سچ ہے تو جمہوریہ ناداں کے لئے چاند
ہے مہرِ شہنشاہیٔ ماضی سے یہ ضو مند

(۱۹۵۰ء)

فنکار سے

غمِ زمانہ ہے تیرا غمِ نہاں فنکار
اسے مثال خذف ریزۂ خس و خاشاک

گر اپنی تیزیٔ رفتار میں بہا لے جائے
یہ تیز و تند ترا سیل دیدۂ نمناک

تو جان تیرے لہو میں ہے سوزش و حرکت
کہ سوزِ دل سے ہے قائم بلندیٔ ادراک

لہو سے قلب و جگر کے ہے تیرے فن کی نمود
بغیر خونِ جگر ہے یہ نقش صفحۂ خاک

(۱۹۵۰ء)

عکسِ آئینہ

نہ رنگِ محفل نہ شوخیٔ دل نہ اگلی سی آن بان باقی
زمیں تمہاری بدل چکی ہے اگرچہ ہے آسمان باقی

نہ دن کی جلوت نہ شب کی خلوت نہ عیش و عشرت کی زندگانی
وہ جلسہ ہائے طرب ہوئے ختم اب انکی ہے داستان باقی

نہ سر میں سودا نہ ذوقِ حسنِ عمل ہی موجود تیرے دل میں
وہی ہے تو اور وہی ہیں لفظیں مگر کہاں وہ زبان باقی

وہ کاروانِ جہاں ترقی کی شاہراہوں پہ گامزن ہے
مقابلہ کر لے بڑھ کے غافل نہیں ہے کیا تجھ میں جان باقی

تڑپ جو تجھ میں ہوئی نہ پیدا تو یاد رکھنا تم یہ ہوگا
نہ ہوگا تو اس جہاں میں ہرگز نہ ہوگا تیرا نشان باقی

(۱۹۵۰ء)

ز سرتا قدم

سلامِ شوق تجھے اے کہ جانِ رعنائی
شب گذشتہ کئی بار تیری یاد آئی

میں چونک چونک پڑا خواب ناکمل سے
اک اضطراب کا عالم ہے ہر نفس کل سے

مری نگاہ تصور کے سامنے تو ہے
کہ میرے آئینہ دل میں عکس گیسو ہے

میں سوچتا ہوں پری ہے کہ رشکِ برنائی
کہ خُلد سے مری دنیا میں حور اُتر آئی

مرے خیال میں اسطرح سے بسی ہے تو
کہ جیسے پھول کے دامن میں پھول کی خوشبو

وہ تیرا چہرۂ روشن کہ جیسے صبحِ حسیں
وہ آئینہ کی طرح صاف اور چمکتی جبیں

وہ سرخیوں میں نہائے ہوئے حسیں رخسار
کہ جیسے آئینہ حسن میں ہو عکس بہار

جمالِ چہرۂ و رخسار غیرتِ گلشن
فرشتے سیر کو آئیں تو جائیں تر دامن

وہ رُخ کہ جسکو رُخِ روشنِ بہار کہیں
جمالیات کی دوشیزہ کا سنگار کہیں

وہ ناک جسکی بناوٹ پہ دلکشی ہو نثار
ملیحِ حُسن کا دنیا میں جو بنے معیار

وہ کان گوش ثریا بھی جن سے شرمائے
صدائے نالۂ دل جن میں گیت بن جائے

وہ زلف مشک فشاں ہے کسی کی شام وصال
سَحَر کا خوف نہ کر پائے جسکا بیکا بال

وہ آنکھیں جن میں ہے لرزاں کشیدۂ انگور
کہ جن کو دیکھ کے توبہ بھی بھاگ جائے دور

وہ سُرخ ڈورے کہ جیسے اُبلی ہوئی تلوار
لہو میں ڈوبی ہو کرنے کے بعد لاکھوں وار

وہ پتلیاں جو جگاتی ہیں جادوئے بنگال
مثال کا کل شبگوں بہ رنگ شام جمال

شرارتوں کا سمندر حیا کے پانی میں
شراب یا ہے بھری کوزۂ جوانی میں

نگاہیں جن میں گناہوں کے راز پوشیدہ
جو عام طور سے پڑتی ہیں دل پہ دزدیدہ

خموش لب کہ جنھیں فرصت کلام نہیں
مٹھاس جن کی وہ نعمت ہے جو کہ عام نہیں

یہ لب وہ ہیں کہ جنھیں کہئے راگنی کے ریکارڈ
تبسموں کے خزانے ہیں زندگی کے ریکارڈ

جو بولنے پہ ہوں آمادہ اوّلِ شب سے
ستارہ صبح کا ظاہر ہو چاہِ غبغب سے

جو حرف نکلے مریضانِ عشق پہ دم ہو
جگر کا درد گھٹے اور دردِ دل کم ہو

دہن وہ غنچۂ اُمید کی مثال جو ہے
کھلے تو گل کی طرح کاشفِ خیال جو ہے

وہ لب کہ لعل بدخشاں کی طرح سے خوشرنگ
ہوں جن کو دیکھ کے بنت العنب کے عارض دنگ

وہ دانت جن میں صباحت کا اور چمک کا رچاؤ
گرا دیں شہر میں جو گوہرِ عدن کا بھاؤ

صراحی دار وہ گردن بلور کی مانند
چمک میں اپنی جو ہے صبح نور کی مانند

وہ مسکراتا ہوا سینہ حسن کا گلزار
بنا ہے دو گلِ نورس کا جو امانت دار

وہ جگمگاتے ہوئے تیرے ساعد سیمیں
جو کفر شامِ وفا میں بنے ہیں دشمن دیں

ہے انگ انگ میں رگ رگ میں جا بجا وہ تناؤ
کہ جیسے بھیرویں کے راگ کا اتار چڑھاؤ

کمر لچکتی ہوئی پینگ ہے ہنڈولے کی
بڑی لطیف بڑی خوشنما بہت پتلی

کلائیوں میں نزاکت کی پرورش گاہیں
کہ جنکو دیکھ کے بھرتا ہے چاند سرد آہیں

ہتھیلیوں میں حنا کو نواز نے کی خو
مشام جاں کے لئے عشق آفریں خوشبو

ہیں سازِ عشق کی خوشرنگ انگلیاں مضراب
ہر ایک پور میں جن کے رچا بسا ہے شباب

وہ ساقیں جن پہ ہے قصرِ جمال کی بنیاد — کہیں ہم ان کو صنوبر سرشت سرو نژاد
وہ پنڈلیاں کہ جنھیں بت کہیں شوالے کا — زمین چومتی ہے جن کا دلنشیں سایا
مثالِ یشب خوشرنگ پاؤں کے گٹّے — کہ جن کو دیکھ کے چھوٹیں حواس کے چھکّے
کسی طرح سے نہیں گھٹتا اضطرابِ دل — زبان کھولوں تو مشکل نہ کھولوں تو مشکل

کچھ اعتبار نہیں جادوئے محبّت کا
قدِ جمیل پہ دھوکا نہ ہو قیامت کا

(۱۹۵۴ء)

اکبر الہ آبادی

آفتابِ زبانِ اُردو تھے — اکبر اپنی جگہ پہ جادو تھے
رونق و زینتِ الہ آباد — ان کو رکھیں گے ہند والے یاد
ان کا انداز تھا جدا سب سے — یعنی یہ ساز تھا جدا سب سے
دوست ملّت کے اور وطن کے دوست — باغبانِ چمن، چمن کے دوست
ان کی آواز تھی الگ سب سے — ان کی پرواز تھی الگ سب سے
طائرِ گلستانِ عہدِ قدیم — یہ تھے اک پاسبانِ عہدِ قدیم
بے حیائی کے سخت دشمن تھے — خود ستائی کے سخت دشمن تھے
ان کے رنگِ سخن میں تھا یہ اثر — اک تبسّم بہ رنگ تیر مگر
اُٹھ گئے حیف ادب کے دفتر سے — شاعرِ خوش کلام اکبر سے

(۱۹۴۰ء)

پیکرِ جمال

مری محبوبہ مری جان تمنا مرا پیار سیمتن غنچہ دہن لالہ رخ و گل رخسار
گلبدن، ماہ لقا، زہرہ جبیں مہر نگار مرے احساس کی بھٹکی ہوئی، صحرا میں پکار

آج بھی رات گئے یاد تری آتی ہے
آگ سی سینۂ افسردہ میں جل جاتی ہے

تیری باہیں ہیں کہ ترشے ہوئے چاندی کے صنم تیرا سینہ ہے کہ بھرپور جوانی کا بھرم
تیری ساقوں میں ہے سنگیت کا پنہاں سرگم ہر خطِ جسم ہے تصویر بدن ہے البم

آج بھی رات گئے یاد تری آتی ہے
آگ سی سینۂ افسردہ میں جل جاتی ہے

تیری زلفیں ہیں کہ ہیں مشک کے پروردہ ناگ اس کے ہر خم میں ہے لہراتا ہوا راگ بہاگ
دامن شام میں سوئے ہوئے پریوں کے راگ یہ دہکتے ہوئے رخسار ہیں یا من کی آگ

آج بھی رات گئے یاد تری آتی ہے
آگ سی سینۂ افسردہ میں جل جاتی ہے

تیرے چہرے کی چمک صبحِ چمن کی زینت تیرے ماتھے کی دمک حسنِ عدن کی زینت
تیری رفتار ہے آہوئے ختن کی زینت تیرا انداز ہے خود تیرے بدن کی زینت

آج بھی رات گئے یاد تری آتی ہے
آگ سی سینۂ افسردہ میں جل جاتی ہے

تو نے گھر اپنا بسایا اُدھر آباد ہوئی
یوں بہ آغوشِ رقیب اپنی جگہ شاد ہوئی

ملتفت کل جو کبھی تھی ستم ایجاد ہوئی
میری مٹی غمِ تقدیر میں برباد ہوئی

آج بھی رات گئے یاد تری آتی ہے
آگ سی سینۂ افسردہ میں جل جاتی ہے

۱۹۵۱ء

ایک ہندو مسلک شریف اور کمسن بیوہ[1]

خانماں برباد، دل برباد، برباد الم
دن جوانی کے بجائے کیف و مستی رنج و غم

کمسنی کی گفتگو سے سادگی ہے آشکار
چہرہ پژمردہ گلِ نو، جسم سارا اشکبار

حسرتیں سمٹی ہوئی سہما شباب پُر جمال
بیوگی کی برق سے باغِ جوانی پائمال

گاہ رنجیدہ کبھی مسرور از فطری اصول
دھوپ چھاؤں میں کبھی تاریک روشن جیسے پھول

جیسے چڑھتی دھوپ میں یکبارگی آجائے ابر
جیسے ناکامی میں اک مے نوش کا کھویا سا صبر

مانگ اجڑی کمسنی میں اور گودی بھی بھری
اس نئے پردے کا بھی لازم ہے پاس دلبری

بے سہارا کا سہارا بس یہی ہے نونہال
پھوٹی قسمت نے بنایا بے محل شوریدہ حال

کر دیا بھگوان نے جیون کو اس کے بے مزا
کھیلتے بچے کو فطرت سے ملے جیسے سزا

بدنصیب و حامل و رنج و محن بچے کی ماں
تن میں جلتا ہے جگر اور دل سے اٹھتا ہے دھواں

اپنے دامن کو کسی دامن سے جاکر جوڑ دے
ہے تمنا کی آرزو بندھن سماجی توڑ دے

۱۹۵۱ء

[1] شاعرانہ زندگی کی چوتھی نظم

سورج

بحرِ انوار میں وہ جھاگ اُٹھے — سازِ فطرت سے تازہ راگ اُٹھے
دولتِ لیل لٹنے والی ہے — گنجِ قارونِ شب سے ناگ اُٹھے
ماہ و انجم کی انجمن ہے اُداس — فتنے سورج کے دیکھ جاگ اُٹھے
زاہدانِ شبِ عبادت رنگ — اپنے آسن کو دے کے تیاگ اُٹھے
وقت کے گھر میں ہے اُجالا سا — خیمۂ شب سے جیسے آگ اُٹھے
خفتگانِ جہانِ ہنگامہ — فرشِ افکار پہ ہیں جاگ اُٹھے
جملہ طفلانِ سنگ وخشت ونبات — دیکھئے کھیلنے کو بھاگ اُٹھے
فرشِ نغمہ پہ بن کے صدرِ نشاط — بھیرویں آئے اور بہاگ اُٹھے
ہاتھ میں ہے لجام کرنوں کی — توسنِ آفتاب باگ اُٹھے
چوم لی کوہ کی کرن نے جبیں — پتھّروں کے نصیب جاگ اُٹھے
لوگ چہروں کے آئینے لیکر — تبصرے کو بغیر لاگ اُٹھے

پھر وہی کاروبار کی دنیا
فکر کی انتشار کی دنیا

۱۹۶۳ء

لیڈر[1]

جدھر دیکھو بشر مصروفِ ورد نفسی نفسی ہے
درونِ شہر و قریہ ہر جگہ حسرت برستی ہے

وہ ہو مزدور یا دفتر کا بابو یا ہو پیشہ ور
گرانی کے سبب سے سب کا جینا ہو گیا دوبھر

فضائے دہر پر سناٹا ہے اک ہو کا عالم ہے
جو ہیں بیکار رشوت خور شہرت کا انھیں غم ہے

عوام الناس کی کشتی کو تنکے کا سہارا ہے
مخالف ہے ہوا طوفانِ غم کا تیز دھارا ہے

پریشانی کے عالم میں لگائے سر پہ اک ٹوپی
بدن میں بنگلہ کرتا اور پاجامہ ہے یا دھوتی

کہیں ہے شیروانی اور کہیں صدری ہے زیبِ تن
ہے چپل پاؤں میں گردن میں ہے کپڑے کا اک بندھن

بڑھے ہیں بال سر کے ملگجی مونچھوں پہ ہے تاؤ
ہے چشمہ آنکھ پہ اور توند کا بڑھتا ہوا بھاؤ

لئے ہاتھوں میں چرمی بیگ اس عنوان کا انساں
کہ جس کو رات میں دیکھو تو سمجھو بھوت یا شیطاں

ہے ظاہر شکل سے اس کی کہ یہ انساں کا شیطاں ہے
گرہ کٹ جیبِ عزت کا ہے یہ دوزخ کا درباں ہے

غذائے بیش قیمت ہر گھڑی ہے زیبِ دسترخواں
مئے شہرت کے پینے سے نہیں فرصت اسے اک آں

نہ جس کو عیش اور آرام کا وہم و گماں تک تھا
سواری اور کوٹھی کیا کرائے کا مکاں تک تھا

جہالت کے اندھیرے میں بدل کر بھیس لیڈر کا
صفایا کر رہا ہے برملا وہ قوم کے گھر کا

ڈرامہ کھیلتا ہے قوم کے اسٹیج کے اوپر
یہ محوِ خواب رہتا ہے گلوں کی سیج کے اوپر

۱۹۴۷ء

[1] شاعرانہ زندگی کی دوسری نظم

زندہ[1] لاش

ضیائے مہر سے روشن ہوا ہے چرخِ مینائی
چمن لہکا گلوں میں از سرِ نو زندگی آئی

طیورِ خوش نوا مشغول حمدِ ایزدِ باری
نسیمِ صبح دہقاں کے لئے ہے پیکِ بیداری

وہ اٹھ کر کھیت کی جانب چلا محنت کا شیدائی
خدا کے فضل سے اُمید پاؤں چومنے آئی

ارادہ کا دھنی ہے کام کا پکّا یہ دہقاں ہے
یہ وہ بھوکا ہے جس سے بھوک خود اسکی پشیماں ہے

اجل کے ہاتھوں جسکی ہو چکی ہے خانہ ویرانی
بجز اک دخترِ رعنا نہیں کوئی جو دے پانی

یہ لاکھوں لڑکیوں سے حسن و رعنائی میں ہے بہتر
بنا رکھا ہے جس کو فکر اور احساس نے کمتر

جوانی کی امنگیں پائمالِ گردشِ دوراں
اُمید نا اُمیدی باعثِ سوزِ غمِ پنہاں

غریبی ساتھ مثلِ سایہ مزدوری وراثت میں
ہے صرفِ آبپاشی خونِ دل باغِ امارت میں

سفالہ پوش گھر کے فرش پہ چکّی چلاتی ہے
یہ اک ٹوٹے دیئے کو داستانِ غم سناتی ہے

فضا خاموش ہے اور اہلِ زر ہیں خوابِ مستی میں
مگر لٹتی ہے مفلس کی جوانی دارِ ہستی میں

محنتی باپ کی بیٹی نہیں محنت سے گھبراتی
قیامت ہے نہیں اہلِ دول کو کچھ حیا آتی

یہ چودہ سال کی دیوی یہ فکرِ عالمِ امکاں
یہ نازک ہاتھ یہ محنت الٰہی میں تو ہوں حیراں

یہ زندہ لاشِ انساں ہے جو محرومِ حرارت ہے
لبِ خاموش پہ جس کے لگی مہرِ مشیت ہے

۱۹۴۹ء

[1] شاعرانہ زندگی کی چھٹی نظم۔

عمل کی راہ میں نامِ حسینؑ لیکے بڑھو[1]

تمام حمد ہے خلاق دوسرا کیلئے — درودِ پاک ہے محبوبؐ کبریا کیلئے
ہزاروں لاکھوں سلام آلِ مصطفیٰؐ کیلئے — سنو بغور ہماری بھی اب خدا کیلئے

ہمارے حق میں بہر حال ہے یہ اچھا سال
کہ اپنی قوم کا ہم کر رہے ہیں استقبال

ہمارے ملک کا مشہور شہر الہ آباد — بہ اعتبارِ حقیقت ہے انقلاب نژاد
نہاں ہے سینۂ گنگ و جمن میں وہ فریاد — جو لب تک آئے تو تاریخ ظلم ہو برباد

بیان شہر کی خوبی کا ہم نہیں کرتے
فغانِ قلب کی توقیر کم نہیں کرتے

یہ مختصر ہے یہاں اہلِ قوم آئے ہیں — مسائلِ غمِ ہستی کی بات لائے ہیں
بیان ہوگا بس ان کا جو دُکھ اُٹھائے ہیں — قدم قدم پہ مصائب کے ابر چھائے ہیں

عجب نہیں کہ لہو آنکھ سے برس جائے
زبان عرضِ حقیقت کو بھی ترس جائے

[1] صوبہ شیعہ کانفرنس ۱۹۶۸ء کے عام اجلاس میں بمقام الہ آباد پڑھی گئی۔

ہماری قوم پہ آئی جو یک بیک آفت　　زمین چھن گئی ہم سے تو لٹ گئی دولت
ہماری بے عملی نے بنائی یہ دُرگت　　کہ اب سنبھلنے کی باقی رہی نہ ہم میں سکت

جو قوم صنعت و حرفت سے دور ہوتی ہے
وہی نصیب کی دولت سے دور ہوتی ہے

نمود و نام کی خاطر ہے انجمن سازی　　رسولؐ پاک کا منبر ہے جائے طنّازی
گروہ بندیاں ہیں بہرِ فتنہ اندازی　　شہید ہم میں نہیں کوئی سب کے سب غازی

ہماری مجلسیں خالی ہیں سوزِ ملّت سے
کہ یہ بھی رسم کی اک جنس ہے تجارت سے

عوام کیا عُلماء کا تو دیکھو حال ہے کیا　　مذاقِ غیرتِ قومی کا اس طرح سے اڑا
درِ نمائش و شہرت پہ ہوتا ہے سجدا　　عمامۂ وقفِ سیاست عبا ہے رہنِ ربا

حدیث و فقہ کی اڑتی ہیں دھجیاں افسوس
اُمیدِ منفعتِ قوم پر پڑی ہے اُوس

عبا بدوش عمامہ بہ سر حدیث بہ لب　　عجم نژاد بہ طینت ادا میں رنگِ عرب
گروہ بند ہیں اربابِ قول، دشمن رب　　جو ان کو جہل مرکب کہیں تو ہے انسب

خدا کے یہ نہیں اربابِ زر کے بندے ہیں
کہ ایک پیٹ کی خاطر ہزاروں چندے ہیں

فقیہہ دین پہ دنیا کو دیتے ہیں ترجیح خطیب کرتے ہیں تعمیرِ گفتگو کی ضریح
ادیب کرتے ہیں تحریر کے گناہِ صریح تمام تر شعراء ہیں اسیرِ ذکرِ قبیح
جہانِ قول میں حسنِ عمل کا نام نہیں
علیؑ کی سیرتِ اقدس کا احترام نہیں

نہ کوئی میثمؓ تمار ہے نہ بوذرؓ ہے نہ کوئی ہم میں ہے سلمانؓ اور نہ قنبرؓ ہے
ہے دل میں "ہائے رقم" یا حسینؑ لب پر ہے کھلا ہے جیب ہوس بند دیں کا دفتر ہے
مذاق کرتے ہیں سلطانِ کربلا کے ساتھ
منافقت کی بناء کرتے ہیں عزا کے ساتھ

نبیؐ کے ماننے والوں کو دین سے دوری علیؑ کے چاہنے والوں کو عارِ مزدوری
حسنؑ پرستوں میں پائی ہے بڑے فغفوری حسینیوں کو ہے قربانیوں میں مجبوری
ہیں بے حجاب کنیزانِ فاطمہ زہراؑ
ہمارے قوم کے ہاتھوں بکی ہے جنسِ حیا

بیاں میں زورِ زباں تیز اور بازو شل ہمارا جوش ہے محرومِ کارگاہِ عمل
ہماری راہ میں ہر ہر قدم پہ ہے دلدل سنبھل مسافرِ راہِ حیات دیکھ سنبھل
جہادِ سیف زباں کا نہیں زمانہ اب
سنا نہ ہم کو تو اجداد کا فسانہ اب

ریاضِ ملّتِ جعفرؑ فقط خیالی ہے　　ہمارے باغ کی مفلوج ڈالی ڈالی ہے
فضا میں سرخیٔ خونِ جگر کی لالی ہے　　ہمارے ہاتھ میں جو جام ہے وہ خالی ہے

مذاقِ میکدۂ شوق جب بدلتا ہے
تو انقلاب کے سانچے میں جام ڈھلتا ہے

مٹا مٹا غمِ حرمان و نقشِ یاس مٹا　　بجا بجا جرس اقتضائے وقت بجا
کھلا کھلا علم اعتماد شوق کھلا　　اٹھا اٹھا قدم کاروانِ قوم اٹھا

ابوترابؑ کے صدقے میں راہ کٹنے لگی
زمینِ منزلِ مقصود خود سمٹنے لگی

اٹھو اٹھو علی اصغرؑ کے چاہنے والو　　اٹھو اٹھو علی اکبرؑ کے چاہنے والو
اٹھو بھی ثانیٔ حیدرؑ کے چاہنے والو　　کمر کو کس لو بہتّر کے چاہنے والو

رہیں گی بزم میں افسانہ خوانیاں کب تک
عمل کا وقت ہے یہ لن ترانیاں کب تک

علیؑ کے نام پہ اٹھو تو کچھ کرو لوگو　　خراجِ قوّتِ بازو کا اعتماد کرو دو
دیارِ غیر میں جا کر نہ بھیک تم مانگو　　زمانے کا جو تقاضا ہے اسکو بھی سمجھو

جو قوم آج زمانے میں خود کفیل نہیں
بقائے نام کی بھی اس کے کل سبیل نہیں

وہ دیکھو سامنے طورِ عمل پہ نورِ حیات　　تمہارے عزم کو ہے حاجتِ قرار و ثبات
طلوعِ صبحِ خوشی ہے تمامِ غم کی رات　　زمانہ سننے کو تیار ہے تمہاری بات

بہ اتّحاد و عمل آشتی کی راہوں میں
چلو چلو تو سہی زندگی کی راہوں میں

ذرا سا معنئ یٰلیتنی پہ غور کرو　　اور اپنے جذبِ عمل کے خلوص کو دیکھو
غضب ہے سوتے ہو دامانِ قول میں لوگو　　خدا کے واسطے لاحول پڑھ کے آج اٹھو

غنا و فقر کا ہے ازدیاد باعثِ شر
یہ قول ایسا ہے جس میں ہے وزن اور اثر

کلامِ پاک میں تم الّا ما سعیٰ کو پڑھو　　سنو اور اپنے کو دورِ جدید تر میں گڑھو
عمل کی راہ میں نامِ حسینؑ لیکے بڑھو　　بڑھو بڑھو تو ذرا بامِ ارتقا پہ چڑھو

پکارتے ہیں تمھیں منزلِ وفا والے
صدائیں دیتے ہیں بڑھ بڑھ کے کربلا والے

نبیؐ اور آلِ نبیؐ کے وسیلے سے یارب　　ہم آج تجھ سے مدد تیری کر رہے ہیں طلب
تو اپنا رحم جو کر دے ہمارے حال پہ اب　　تو ہم سے دور ہو یاس و ہراس و رنج و تعب

قمرؔ ہے بندۂ عاصی غلامِ آلِ رسولؐ
بحقِ ملّتِ جعفر دعا ہو اس کی قبول

۱۹۸۲ء

فریبِ سیاست

ہر شخص کو مشاہدۂ چشم پر یقیں
ہر فرد مادے کے جہاں کا ہے بس مکیں

ہر قوم کے ہے لب پہ سوالِ لباس و ناں
ہر ملک انقلاب کی بھٹّی میں ہے تپاں

سونی ہے بزمِ دہر ہر اک روشنی ہے ماند
شمعیں اگر ہیں گریہ کناں نوحہ خواں ہے چاند

کوئی مثالِ شمعِ شبستاں خموش ہے
کوئی اسیرِ میکدۂ ناؤ و نوش ہے

کوئی غریب اور کوئی سرمایہ دار ہے
کوئی بلا نصیب محن کا شکار ہے

میں آپکا تم اسکے وہ اسکا عدو ہے آج
آمادۂ نزاع ہر اک دو بدو ہے آج

بم ہیں کہیں، کہیں پہ ہے گیسوں کی دھوم دھام
نوعِ بشر کے خاتمہ کے ہیں یہ اہتمام

امریکہ کا کسی سے ہے رشتہ جڑا ہوا
برطانیہ کے در پہ کوئی سر جھکا ہوا

قبلہ کسی کا روس کسی کا بنا ہے چین
اور مارکسی اصول کسی کے اصولِ دین

ہے دور خلفشار زمانے میں ہر کہیں
اس دورِ ابتری میں کوئی بھی تو خوش نہیں

سارا جہاں نمونۂ دوزخ بنا ہے آج
فرعون کا کہیں کہیں دجّال کا ہے راج

عقل و خرد کی ہو گئی انسان میں کمی
انسانیت کا نام مٹاتے ہیں آدمی

انساں درندگی سے بغلگیر و ہمکنار
انسانیت کے رُخ پہ سیاست کا ہے غبار

دنیا کے امن میں عجب اک انتشار ہے
ہر جا شکم پُری کے لئے لوٹ مار ہے

موقع شناس خبطِ حکومت لئے ہوئے
ہاتھوں میں اپنے تیغِ سیاست لئے ہوئے

آتا ہے درمیان میں مزدور کے کبھی
جاتا ہے بزم میں کبھی سرمایہ دار کی

مزدور کا نہ دوست نہ سرمایہ دار کا
یہ خود پرست دوست ہے اپنے وقار کا

اوڑھے ہوئے قبائے سیاست اِدھر اُدھر
مکار پھر رہا ہے تو ہشیار رہ بشر

سن ۱۹۵۱ء

مُعلّم[1]

کون ہے جس نے کہ سمجھا رازِ قلبِ کائنات
کون ہے کس نے کیا تجزیۂ موت وحیات

کس نے انساں کو بنایا عارفِ انسانیت
کس نے سکھلایا ہے تمکو نغمۂ وحدانیت

کس نے ذہنوں میں تمدن کا کیا روشن چراغ
کس کے باعث ہم کہے جاتے ہیں آج اہلِ دماغ

عقل واستدلال تھا تجھ میں یہ ہوں میں مانتا
تو نہیں لیکن تھا اپنے نیک وبد کو جانتا

عقل سے تیری کیا ہے جس نے تجھکو روشناس
وہ معلّم ہے پہنایا علم کا جس نے لباس

وہ مُعلّم ہے مٹائی جس نے ذہنی برہمی
جس نے فرزندانِ آدم کو بنایا آدمی

شکلِ ناکامی میں جو ہے کامیابی کا پیام
موت میں جس کے چھپی ہے قوم کی عمرِ دوام

مضمحل قوموں میں پیدا کر دیا جوشِ شباب
موقع آنے پر دیا ہے جس نے درسِ انقلاب

شمع جس کی زیست ہے راہِ ہدایت کیلئے
سادگی تلوار جس کی زعمِ شوکت کے لئے

وہ مُعلّم ہی نہیں جس میں نہو اخلاق وحلم
اپنے پر غیروں کو دو ترجیح یہ ہے شانِ علم

[illegible]

سن ۱۹۴۹ء

[1] شاعرانہ زندگی کی پانچویں نظم

گاندھی جینتی[1]

چاند کے رُخ پہ ہویدا ہیں فنا کے آثار
کہکشاں ختم ہوئی گھٹ گیا تاروں کا نکھار

یک بیک نورِ سحر چہرخ بریں پہ چمکا
کارواں رات کا رخصت ہوا با نالۂ زار

یادِ حق شیخ و برہمن کے لئے لازم ہے
یہ ہے تسبیح کا شیدا وہ فدائے زُنّار

منظرِ صبح سہانا ہے عجب مستی ہے
کتنا پُر کیف ہوا جاتا ہے بھارت کا دیار

مادرِ ہند کی عصمت کو بچانے کیلئے
صلب سے کابا[2] کی پیدا ہوا ہے اک گلعذار

چمنِ ہند میں آئی ہے بہارِ تازہ
نخلِ اُمید ہرا ہو کے لگا کرنے پکار

حرّیت ناز کرے جس پہ وہ طفل آپہونچا
آیا آزادیٔ بھارت کا وہ اعلیٰ معمار

رہبرِ قوم ہے یہ طفل نہ سمجھو اس کو
اسکی ہر بات پہ مرنے کے لئے ہو تیّار

نام موہن ہے صفت موہنِ متھرا کی ہے
کہیں ایسا تو نہیں ہے یہ انھیں کا اوتار

کوئی ہندو ہو کہ مسلم ہو کہ عیسائی کہ سِکھ
بحث ملّت سے نہیں یہ ہے سبھوں کا غمخوار

اہنسا فخر کرے جس پہ وہ ہے ذات اسکی
قوم انگریز کی خاطر یہ ہے خاموش شرار

اس نے انگریزوں کے چنگل سے چھڑایا ہمکو
سامنے اس کے ہوئے طوق و سلاسل بیکار

ایم کے گاندھی کہ مہا آتما کہتے ہیں جسے
جس کی ہستی ہے کہ مجموعۂ حُسنِ اسرار

اس کے اخلاق کی کرنوں سے ہے بھارت معمور
اس کی باتوں نے اتارا مئے مغرب کا خمار

سارے انسان برابر تھے نظر میں اسکی
اونچ اور نیچ کی تفریق یہ تھی اسکو عار

۱۹۱۸ء

[1] شاعرانہ زندگی کی پہلی نظم [2] کابا گاندھی

لغزشِ فکر

(۱)

گردشِ سال و مہ و روز کی کجلائی ہوئی
وہ تری شربتی آنکھوں کی لچکدار نگاہ
کتنی پُرپیچ پُر اسرار ہے پُرمعنی ہے
سینکڑوں خواب گہہ عشق کی رعنائی میں
گھولتی پھرتی ہے سیماب غنا قندِ حیات
رقص فرما دلِ بیتاب کے کاشانے میں
کتنے ہی جادو جگائے ہوئے تا حدِّ نظر
شمعِ ہستی کے کئی رنگ میں جل جانے تک
رہ سکی عہدِ جوانی کی نہ ممنون کرم
یہ بھی اک شانِ خودی عظمت ادوار کی ہے
میں کہ سرمست اُسی چشم فسوں کار کا ہوں
زندگی ہے کہ نگاہوں کی اسیری کے لئے
جی رہا ہوں میں ترے در کی فقیری کے لئے
آج بدلے ہوئے ماحول کے اس دور میں بھی

(۲)

جب کہ طوفان بلاخیز غمِ دوراں میں
آدمی کیا کہ گھرانے بھی بہے جاتے ہیں
ہم سے بیتاب ہے دھرتی کی کسک دورِ فلک
بد دعا دیتی ہے فطرت تو مرے جاتے ہیں
اور یہ دھرتی یہ آکاش نہیں ہیں مجرم
ان کی ہر نعمت و دولت کے چراغوں کے تلے
ایک سایہ ہے اندھیرا ہے اندھیرا وہ بھی
التفاتِ نگہِ یار کی اک صورت ہے
اپنے غمخواروں کی خود ساختہ اک مورت ہے
یہ اٹھا لائے ہیں خود دشت فراموشی سے
چاک دامانی گریباں ہیں دیوانوں کے
یہ اندھیرا انھیں ٹکڑوں کی نمائش ہے اے دوست

سنہ ۱۹۶۳ء

صنما!

مری نگاہ میں اب بھی تری جوانی ہے　　دلِ غریب پہ اک نقشِ مہربانی ہے
نہ جانے کتنی مصیبت مجھے اُٹھانی ہے　　تو میرے پیار کے اندھے نگر کی رانی ہے
ترا جمال مرے عشق کی کہانی ہے

وہ بالاخانے کے اوپر یہ ابتداء سلام　　کیا تھا اوٹ سے پردے کی جبکہ تونے کلام
بلایا مجھکو محبت سے بھیج بھیج پیام　　وہ پہلا نقش تکلف بھی جاودانی ہے
ترا جمال مرے عشق کی کہانی ہے

وہ تیری چشم تمنا کی تشنگی تو بہ　　بہ اقتضائے مروت سرک گیا پردہ
تو جم گیا مرے دل پہ جمال کا سکہ　　میں جانتا نہ تھا یہ طرزِ دلستانی ہے
ترا جمال مرے عشق کی کہانی ہے

وفا کے نام پہ میں نے لگایا تجھ سے جو دل　　تلاشِ راہ میں گمُ ہو گئی مری منزل
عزیز جان سے جو تھی وہی بنی قاتل　　نظر میں آج بھی سحر آفریں جوانی ہے
ترا جمال مرے عشق کی کہانی ہے

وہ شام جس کو محبت کی شام کہتے ہیں　　فریبِ حسنِ عقیدت کی شام کہتے ہیں
یہ نوجواں جسے حسرت کی شام کہتے ہیں　　وہ حادثات کی محبوب ترنشانی ہے
ترا جمال مرے عشق کی کہانی ہے

۱۹۵۴ء

صیدِ افلاس[1]

دوپہر کا وقت تھا اک گاؤں کے بازار میں ۔۔۔ ایک حسیں گُل جل رہا تھا ایسے آتش زار میں

یعنی بد قسمت غریب و دختر سبزی فروش ۔۔۔ اک دکانِ خورد لیکر تھی جو بیٹھی گرد پوش

دھول چہرے پر پڑی تھی اور پسینہ تھا رواں ۔۔۔ شدت گرما سے ہوتی جا رہی تھی نیم جاں

گول چہرا، ابروئیں خمدار، آنکھیں سُرمگیں ۔۔۔ قد مناسب، بال لمبے، ناک نقشہ سب حسیں

کان میں بالے دہاتی ہاتھ میں تھی چوڑیاں ۔۔۔ میلے کپڑوں سے سراسر اسکی غربت تھی عیاں

آرزوئیں دل ہی دل میں رہ گئی تھیں بن کے داغ ۔۔۔ حسرتیں اُس کی تھی گویا صبح کا بجھتا چراغ

خونِ دل بندیے ماتھے کی ٹپک کے رہ گیا ۔۔۔ حیف وہ ارمان جو دل میں سسک کے رہ گیا

نوجواں تھے شوقِ شیطانی میں اسکو گھورتے ۔۔۔ بے سبب ترکاریوں کا بھاؤ آکر پوچھتے

رہزنِ عصمت، رئیس دیہہ اسکی تاک میں ۔۔۔ پھر رہے تھے نفس کے خادم حسیں پوشاک میں

چھیڑتے تھے اسکو مفلس اور تنہا جان کے ۔۔۔ میں یہ سمجھا بھیڑیے ہیں بھیس میں انسان کے

اے فلک اے گردشِ ایام یہ نیرنگیاں ۔۔۔ خون سے غربت زدوں کے کھیلتا ہے ہولیاں

دیکھنا ہے تابہ کے تیری ستم رانی کا دور ۔۔۔ قصر سرمایہ میں خونیں مے کی ارزانی کا دور

متحد ہوکر غریبو توڑ دو نخوت کا سر ۔۔۔ رہزنِ عفت جو ہو اس صاحبِ ثروت کا سر

اے اسیرانِ الم تم کو بھی راحت چاہیئے ۔۔۔ تم بھی ہو انسان تم کو بھی مسرت چاہیئے

ہیچ ہے بے آبرو رہ کر حیاتِ جاوداں ۔۔۔ بڑھ کے اے غربت زدو لے لو حکومت کی عناں

۱۹۱۹ء

[1] شاعرانہ زندگی کی ساتویں نظم۔

انسان[1] اور چیونٹی کا مکالمہ

مرد ناداں تھا سڑک پر ایک دن محو خرام
کر کے خالی کبر و نخوت کے کئی رنگین جام

نشہ میں وہ آدمی ہونے کے اپنے چور تھا
موت کے ہلکے تصوّر سے بھی کوسوں دور تھا

روندتا چلتا تھا مخلوق خدا کو بے ہراس
آدمیت کا اسے اپنی نہ ذرّہ بھر تھا پاس

دفعتاً پیروں تلے چیونٹی جو اس کے آ گئی
فضلِ حق سے بچ گئی مرنے سے تو گویا ہوئی

بے سبب کیا جان لینے میں بھی ہوتا ہے ثواب
اس سوال مور پہ اس مرد کا تھا یہ جواب

میں پسر آدمؑ کا ہوں مجھ پر ہے حق کا التفات
صرف میرے واسطے پیدا ہوئی یہ کائنات

میں ہوں انساں میں شرفِ مخلوق کا ہوں برملا
فرض ہے یہ جانداروں کا کہ ہوں مجھ پر فدا

یہ سخن سن کر نہ چیونٹی کو رہی پھر تابِ ضبط
یوں لگی کہنے کہ انساں ہونے کا ہے تجھ کو خبط

میں بتاتی ہوں تجھے ناواقفِ رازِ حیات
میں بتاتی ہوں تجھے کیا ہے نظامِ کائنات

مرتبہ پودوں کا پتھر سے بہت ہی ہے بلند
پودوں سے حیوان بڑھ کر ان سے انساں جاہ مند

زندگی آخر کی اول پر ہے مبنی بالیقیں
جان لینا بھی کسی کی بے سبب بہتر نہیں

'چھوٹے[2] کیڑوں کو نہ سمجھو تم کہ بے وقعت ہیں یہ
اس خدائے واحد و قہار کی صنعت ہیں یہ'

'کرمِ کم مایہ کو بھی حاجت اسی خالق کی ہے
زندگی کا بخشنا قدرت اسی خالق کی ہے'

'موت دے کر پست مخلوقات کو ہو شرمسار
جب کہ تجھکو زندگی پہ کچھ نہیں ہے اختیار'

راہ سے قدموں کو اپنے تو ہٹا لے تیز گام
تا گذاریں ساتھ عشرت کے یہ کیڑے صبح و شام'

۱۹۰۹ء

[1] شاعرانہ زندگی کی آٹھویں نظم۔ [2] ماخوذ از انگریزی

آئینہ خانہ

آواز سے بے خواب ستاروں کو سلا دے — رفتار سے سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دے
ممکن ہو تو چہرے سے نقاب اپنے ہٹا دے — معصوم نگاہوں کو گنہ گار بنا دے

اے حسن جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

دیبا و حریر اطلس و کمخواب کے پردے — تار نگہہ دیدۂ بیتاب کے پردے
ہٹ جائیں اگر عالمِ اسباب کے پردے — دنیا کی ہر اک شے کو تو پیغامِ فنا دے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

جلوؤں کی لطافت مری آنکھوں میں سمائے — خود دیدۂ حیرت مجھے آئینہ دکھائے
شوقِ اَرَنِی طور کا افسانہ سنائے — مجھکو مرے احساس کی تصویر بنا دے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

بوئے نم کاکل سے ہو وہ ابر ہویدا — لیلائے شب وصل ہو سو جان سے شیدا
حسنِ رُخِ روشن سے چمک ایسی ہو پیدا — جو خرمنِ تقدیس پہ اک برق گرا دے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

جادو نگہہ ناز کا پیمانے کے اندر — انگڑائیاں لے حسن کے کاشانے کے اندر
اعجاز دکھا آج تو میخانے کے اندر — جوئے لبن و کوثر و تسنیم بہا دے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

وہ جام دے جس جام میں عرفان جنم لے — ہر موج مئے ناب میں ایمان جنم لے

قلقل کے ہر آہنگ میں قرآن جنم لے — نزدیک نہ آئیں کبھی توبہ کے ارادے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھادے

ہر چاروں طرف تذکرۂ حسنِ مقدر — میں ہوں تری محفل ہو کھنکتے ہوئے ساغر

للچائی نگاہوں میں تمناؤں کے دفتر — واعظ کے نظر آئیں بدلتے ہوئے جادے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھادے

زہرہ بہ جبیں تیغ بہ ابرو و پری رو — آنکھوں میں جگائے ہوئے بنگال کا جادو

آئینہ بہ رخسارہ و فردوس بہ پہلو — رنگین جو عشوے ہیں تو انداز ہیں سادے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھادے

ماتھے پہ سجائے ہوئے توریت کے آیات — انجیل بہ سینہ ہے کہ اللہ کی سوغات

موباف میں باندھے ہوئے گیتا کے روایات — نغمات زبور آج سرِ بزم سنادے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھادے

عارض ہیں کہ قرآن کا آئینہ عصمت — گلرنگ لب ناز حدیثوں کی امانت

خال و خطِ رخ ہیں کہ تفاسیر کی دولت — تصویر خموشی کو تو پھولوں سے سجادے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھادے

ہر ساز کی آواز ہر آواز کا باجا — ہنگامۂ جذبات ہے طوفان کی دنیا

گہہ بربط و چنگ و دف و طنبورہ و قرنا — پھر کشتۂ تقدیر کو اکبار صدا دے

اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

پلکوں پہ لرزتے ہوئے احساس کے آنسو کہتے ہیں بعنوان دگر تجھ سے پری رو
ہو جائے کسی طرح میسّر ترا پہلو دل پھر تری بھرپور جوانی کو دعا دے
اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

پردہ ہے ترا یا کہ دل و جاں پہ بنی ہے جلوہ ہے کہ نظروں کی یہ ہمت شکنی ہے
جاں بخش مگر تیری یہ شیریں سخنی ہے رہ کر پسِ پردا کبھی آواز سنا دے
اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

ہر زاویۂ شوق پہ دل تنگ کرے ہے جذبات سے میرے تری ضد جنگ کرے ہے
شیشے کو حریفِ نگہ سنگ کرے ہے جب چاہے جسے جیسا اُسے ویسا بنا دے
اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

زلفوں کی درازی شبِ فرقت میں سمو کر خود مجھکو مرے غمکدۂ عشق میں کھو کر
جاتا ہے کہاں دیکھے مجھے یاس کی ٹھوکر اب خرمنِ احساس میں تو آگ لگا دے
اے حسنِ جہاں سوز مجھے جلوہ دکھا دے

۱۹۴۹ء

رباعی

قتّالِ زمانہ ہے جو شمشیر نہ دیکھ پاؤں میں لپٹ جائے جو زنجیر نہ دیکھ
اللہ بچائے تجھے ہر آفت سے نادان خبردار ! وہ تصویر نہ دیکھ

۱۹۵۶ء

تاجدارِ ہند[۱]

اے کہ دمساز امیرِ کاروانِ سلطنت — اے کہ تیری ذات روحِ رہروانِ سلطنت
اے درِ نایابِ بحرِ بیکرانِ سلطنت — اے کہ تو روشن شعاعِ شمعدانِ سلطنت

اے علمدارِ اہنسا تیرا مسلک تھا جدا
ہندیوں کا مغربی طوفاں میں تھا تو ناخدا

تیرے مرنے میں بھی پوشیدہ ہے رازِ زندگی — اے کہ تیری ذات تھی مضرابِ سازِ زندگی
زندگی اک جنگ ہے تو شاہبازِ زندگی — خوب سمجھا زندگی کو بے نیازِ زندگی

ختم کر کے زندگانی قومیت کے جوش میں
سو رہا ہے چین سے تو موت کی آغوش میں

تیرے اندازِ سخن نے دہر کو تھرا دیا — تیری تحریکوں نے مغرب کا جگر برما دیا
لفظ ناممکن غلط ہے تو نے یہ بتلا دیا — قول کو اپنے عمل کا آئینہ دکھلا دیا

پختہ کارِ عزم تجھ سا راہبر حاشا نہیں
کہنے کو لاکھوں ہیں دنیا میں مگر تجھ سا نہیں

غیرت کا جس نظامِ زندگی پر بار تھا — پیکرِ انساں میں تو ہی امن کا اوتار تھا
تجھکو نسلِ آدم خاکی سے کتنا پیار تھا — اس کا سب اقوامِ شرق و غرب کو اقرار تھا

حیف بیگانہ وہی جو تھا یگانہ بن گیا
آہ تو ظالم کی گولی کا نشانہ بن گیا

۳۰ جنوری ۱۹۴۹ء

۱؎ گاندھی جی کی پہلی برسی کے موقع پر۔

شہر آشوب

آشوبِ چشمِ سرخیٔ فصلِ بہار ہے — زحمت بگوش نغمۂ دراج و سار ہے
الٹا ہوا جو یوں ورقِ روزگار ہے — فتنہ پرست گردشِ لیل و نہار ہے
علم و عمل کے دہر میں جادے بدل گئے
ہر بوالہوس کے اب تو ارادے بدل گئے

تحقیق کی جہاں میں جو تحقیر ہو گئی — ہر جنبشِ قلم غمِ تحریر ہو گئی
محتاج نالہ دہر میں تاثیر ہو گئی — کتنی حسین خواب کی تعبیر ہو گئی
بلبل کا ذکر نذرِ زاغ و زغن میں ہے
ہر گل کی جا پہ خار نمایاں چمن میں ہے

آوارہ گردِ میکدۂ و خانقاہ ہے — طوفاں بدوش شورشِ موجِ نگاہ ہے
دنیا اسیرِ پنجۂ زہد و گناہ ہے — تشکیک کی نظر میں یہ عالم سیاہ ہے
تفریقِ مسلکِ حق و باطل نہیں رہی
افسوس بیچ میں حدِ فاصل نہیں رہی

ہر شخص ہے بنا ہوا جویائے انبساط　　سرمایۂ حیات ہے سرمایۂ نشاط
پیغام افتراق ہے یہ فصلِ اختلاط　　مفقود سچ تو یہ ہے کہ ہے نام ارتباط
باہم جو ربط ہے بھی تو مقصد کچھ اور ہے
لب پر ہنسی ہے دل میں مگر کد کچھ اور ہے

اپنے لئے بنائی ہے ہر اک نے ایک راہ　　چھوڑا جماعتوں کو تو ایسے ہوئے تباہ
تاویلیں کر رہے ہیں عمل کی یہ خوامخواہ　　عذرِ گناہ سچ ہے کہ ہے بدتر از گناہ
پیسا جو سنگ وقت نے برباد ہو گئے
دلشاد تھے جہاں میں جو ناشاد ہو گئے

تازہ شریعتیں لئے پھرتے ہیں بدتمیز　　خود ساختہ اصول دل و جاں سے ہیں عزیز
پیتے ہیں چھپ کے شب کو بس پردۂ نبیذ　　رہتی ہے ان کو جستجوئے لقمۂ لذیذ
نذر و نیاز سے انھیں لیکن ہے احتراز
اللہ رے ڈھونگ سنتِ دیں سے ہیں بے نیاز

خوفِ خدا نہ خوف رسولِ کریم ہے　　یوں عام اب پرستشِ نفسِ لئیم ہے
شیطان کی طرح سے بشر بھی رجیم ہے　　خوفِ سزا نہ خواہشِ باغِ نعیم ہے
دولت ہے نار اور یہ دولت بہشت ہے
کعبہ یہی کلیسا و دیر و کنشت ہے

۱؎ صوتی اعتبار سے قافیہ قرار دیا گیا ہے۔

شہرت کے غم میں لوگ ہوئے ایسے بدحواس
دینِ خدا کا بھی نہ رہا ان کو کوئی پاس
مُنھ میں جو آیا بک گئے بے خوف و بے ہراس
احساس کمتری انھیں اسطرح آیا راس
ممکن نہ تھا ملک بنیں شیطان بن گئے
بدنام ہو کے فخر سے مردود تن گئے

دنیا و دیں ہیں دست و گریباں یہ کیا ہوا
جاہل بنے ہیں عالمِ دوراں یہ کیا ہوا
فتنوں کے ہوتے جاتے ہیں ساماں یہ کیا ہوا
عالم میں دیکھ خالقِ سبحاں یہ کیا ہوا
دنیا ملی نہ دین ملا دونوں کھو گئے
ہم آکے اس جہاں میں مقدر کو رو گئے

اے فتنۂ سیاستِ ابلیس الاماں
اُڑنے لگی ہیں دامنِ آدمؑ کی دھجیاں
شعلے بلند ہو گئے تا حدِ آسماں
یہ ناریوں کی جرأتِ کامِ شرر فشاں
جو منھ میں آیا بک گئے مجنون کی طرح
اقوال ان کے پھیلے ہیں طاعون کی طرح

مذہب کے نام پر ہیں دلآزاریاں تمام
باہم گر ہے جنگ تو متروک ہے کلام
لوگوں کو حق سے واسطہ کچھ ہے نہ دیں سے کام
یہ چاہتے ہیں دولت و شہرت کا ایک جام
مذہب کا نام لیکے یہ نعمات کے مگس
لڑتے ہیں زر کشی کے لئے بندۂ ہوس

خود ساختہ جو دہر میں ہیں حاکم عنید　　ایجاد کرتے رہتے ہیں وہ بدعت مزید
شیطاں سرشت مرکزِ صد لعنت شدید　　ہو کر یزید بنتے ہیں عالم میں بایزید[1]
مقصود صرف نام و نمود اس جہاں میں ہے
ہشیار باش رہزنِ دیں کارواں میں ہے

مزدور پر حکومت سرمایہ دوستاں　　گلچیں ہیں سرپرست مفاداتِ گلستاں
صیاد عندلیبوں کے بن کر نگاہباں　　کرتے ہیں ریزہ ریزہ پرِ انبساطِ جاں
بازارِ حرص دہر میں نوچ اور کھسوٹ ہے
انسانیت کے فرق شرافت پہ چوٹ ہے

مہنگا ضرورتوں کا جو سامان ہو گیا　　افلاس ہر مکان میں مہمان ہو گیا
ننگِ وجود آج کا انسان ہو گیا　　کہئے تو صاف کہہ دوں کہ حیوان ہو گیا
اک آگ سی لگی ہے دیارِ حیات میں
جلتا ہے آدمی کا جگر کائنات میں

حاکم خدا کے ہمسر و ہمراز بن گئے　　رزاق بن کے مفسدہ پرداز بن گئے
طاقت ہوئی نصیب تو کج باز بن گئے　　حق ناشناس مردِ ستم ساز بن گئے
محکوم اپنی نانِ شبینہ کے واسطے
خاموش ہیں تحفظ کینہ کے واسطے

۱۹۵۹ء

[1] حضرت بایزید بسطامی

گرد شہید نیست حسینؑ کہ در جہاں — بسیار اندو رنہ یزیدانِ بد زبان

مولانا روم گفت ثمر بہر عارفاں — رازِ حیات بود چنیں کرد او عیاں

باطل بہ طاقت و غلبہٴ حق نمی شود

حق ناشناس جانب دارِ سقر رود

اسپینؔ سے گجرات تک

اے مسلماں خوابِ ابراہیمؑ کی تعبیر بن — کارگاہِ زندگی میں پیروِ شبیرؑ بن

دشمنوں کے واسطے اخلاق کی شمشیر بن — سورۂ اِنَّا فتحنا کی کھُلی تفسیر بن

سینچ دے اپنے لہو سے گلستاں اسلام کا

کلمہ پڑھوا دے زمانے کو نبیؐ کے نام کا

دہر میں پھولے پھلے قومِ رسولِ ہاشمی — وقف کر دے دین کی خاطر تو اپنی زندگی

ہر نفس ہر لمحہ ہو سبطِ نبیؐ کی پیروی — موت سے آنکھیں ملانا سیکھ لے مثلِ علیؑ

مومنِ کامل بہ الفاظِ دگر انسان بن

حاملِ دامانِ پاکِ عترت و قرآن بن

دب نہیں سکتا مسلماں اقتدارِ گبر سے — قوتوں کو زیر کر دے پائے عزم و صبر سے

خوف کھانا جرم ہے طاغوت جور و جبر سے — مہر کی صورت نکل آ غم کے گہرے ابر سے

لہ گجرات کے فسادات سے متاثر ہو کر

جلوۂ کردار سے چمکا دے ایوانِ حیات

اے شہیدِ مسلکِ توحید اے جانِ حیات

جو پیمبرؐ سے ملا اس جام کی ذلّت نہ کر　　لغزشیں کر کے مئے اسلام کی ذلت نہ کر

تو مسلماں ہے تو اپنے نام کی ذلّت نہ کر　　خالقِ کونین کے احکام کی ذلت نہ کر

دہر میں تو آشنائے رمزِ الا اللہ بن

جادۂ انسانیت میں یعنی شمعِ راہ بن

عارفِ اسرارِ حق ہو آدمی ہے اسلئے　　وقفِ راہِ بندگی ہو زندگی ہے اِسلئے

تیرے دل میں عشقِ خالق کی کمی ہے اسلئے　　صرف لب سے قائلِ ذاتِ نبیؐ ہے اِسلئے

ہے مکافاتِ عمل محدود تیری ذات تک

ایک ہی ہے رسمِ ظلم اسپین سے گجرات تک

۱۹۸۲ء

مذاقِ دید

رہینِ دید ہے قدرت کی کار فرمائی　　رہینِ دید ہے کون و مکاں کی رعنائی

نگاہِ خلق کو ہے احتیاجِ نظارہ　　وہ حسن کب ہے ؟ نہ ہو گر کوئی تماشائی

مذاقِ دید بلندی پہ ہے مقام ترا

کہ تیرے دم سے ہے چشمِ خرد میں بینائی

۱۹۳۲ء

بچپن، جوانی اور بڑھاپا

(بچپن)

وہ بچپن جو کہ گہوارے میں میٹھی نیند سوتا ہے
کبھی ہنستا ہے سوتے سوتے اٹھ جاتا ہے، روتا ہے

وہ بچپن گود میں جو مادرِ مشفق کی پلتا ہے
حدوں سے اپنی کوشش کرکے کچھ آگے نکلتا ہے

جو اپنے ساتھیوں میں کھیلتا رہتا ہو دن بھر
وہ بچپن جس کی دنیا کچھ کھلونے اور گھروندا گھر

وہ بچپن اصل میں شاہی کے جو انداز رکھتا ہے
کہ جس کے ابروؤں کا ہر اشارا ناز آرا ہے

وہ بچپن لطف افزا مدرسہ کی ہے فضاؤں میں
جو برسوں پرورش پاتا رہا الفت کی چھاؤں میں

وہ بچپن جس کے خوابوں کی نہیں تعبیر ہوتی ہے
نہایت خوشنما رنگین جو تصویر ہوتی ہے

مچل جاتی ہے فطرت جس کی بے پروا اداؤں پر
تمنا اپنے سر کو رکھ دیا کرتی ہے پاؤں پر

عموماً جب نمو کی قوتیں بیدار ہوتی ہیں
تو خود طفلی سے اپنی برسرِ پیکار ہوتی ہیں

(جوانی)

شباب اس دم جنم لیتا ہے بچپن ہوتا ہے رخصت
نظر آتی ہے جب ہر چیز کے اندر کوئی جدت

نئے جذبات میں ہر شے نئی معلوم ہوتی ہے
حقیقت میں خوشی اپنی خوشی معلوم ہوتی ہے

سلونے، موہنے چہرے پہ حسنِ نو کی رعنائی
امنگوں سے لہو میں گرمیٔ تازہ کی پیدائی

نئی فکریں نئے کام اور عمل کی قوتِ فانی
عموماً بے خبر اپنی اجل سے وائے نادانی

جمالِ عشق کا پردہ جوانی چاک کرتی ہے
جھجھک طفلی کی جو بھی تھی اُسے بیباک کرتی ہے
مسائل زندگی کے کہنے کو آسان ہوتے ہیں
جوانی کے لئے لیکن وبالِ جان ہوتے ہیں
عمل کی راہ میں بڑھتی جوانی خواب مستی ہے
بہک جائے تو گویا خوگرِ فطرت پرستی ہے
جوانی موت ہے طفلی کی لیکن خود بھی فانی ہے
بڑھاپا جس کو کہتے ہیں وہی مرگِ جوانی ہے

(بڑھاپا)

بڑھاپا زندگی کا انحطاطی دور ہے شاید
ابھی تک مسئلہ یہ سخت زیرِ غور ہے شاید
بڑھاپے کی حقیقت سے ہیں ناواقف جہاں والے
بظاہر یہ سمجھتے ہیں مٹے ہستی کے متوالے
بڑھاپا اک تھکن ہے جادۂ دشوار ہستی کی
کہ یہ صورت ہے جملہ قوتوں کی تنگدستی کی
ضعیفی زندگی کے خواب کی تعبیر ہوتی ہے
کہانی جھریوں سے پھر نئی تحریر ہوتی ہے
عصا بردارئ قصرِ جوانی فرضِ پیری ہے
خراجِ قوتِ فکر و عمل تو قرضِ پیری ہے
اجل کے خوف سے ہوتی ہے تن میں کپکپی پیدا
خیالِ قبر میں آنکھوں کی نیند اڑ جاتی ہے اجلا
غذا سے روح کو چاہت کوئی رہتی نہیں باقی
کہ جسم و روح کے مابین ہو جاتی ہے ناچاقی
غرض بچپن، جوانی اور بڑھاپا خواب ہیں تینوں
اجل کی جستجو میں رات دن بیتاب ہیں تینوں

۱۹۵۹ء

جوانی دیوانی

آغاز جوانی کے وہ گذرے ہوئے ایام
امید بھری صبح تمناؤں بھری شام

ہر سانس میں جلتے ہوئے ارمانوں کے دیپک
صد لغزشِ بیچارگیٔ شوق بہر گام

مجبوری عصیاں کی طربناک فضائیں
مجبوریٔ منظورِ نظر رہزنِ آرام

آوارہ خیالات پریشان نگاہیں
ہر کوچۂ رنگیں میں گذر جانے کا الزام

اک غیر شعوری سی تلاشِ غمِ ہستی
ہر چند مداوائے غمِ عشق بد انجام

ہر گام پہ وہ جستجوئے دردِ محبت
تسکینِ دلِ زار کی اک کوشش ناکام

ہستی کے مقاصد کا وہ بے ربط تصور
نادانیٔ جذبات کی ہر بات میں ابہام

ہر موڑ پہ اٹھتا ہوا جذبات کا طوفاں
اور باڑھ پہ احساس کا دریائے سبک گام

ناکامیٔ عصیاں کے ہر احساس پہ توبہ
انجام فراموش گناہوں کا وہ الہام

ہر گام پہ نیکی و بدی دست و گریباں
آغاز کے امرت میں گھلی تلخیٔ انجام

ہر شر میں کسی خیر کے پہلو کی توقع
دنیائے تصور میں فراوانیٔ اوہام

وہ دل کے حرم میں بتِ ارمان و تمنا
وہ ذہن کے مندر میں پنپتا ہوا اسلام

رہ رہ کے دلِ زار کو دیتا ہے ٹھوکے
اک کھوئی ہوئی چیز کا وہ بھولا ہوا نام

کیا ہو گئے وہ دن یہ بشر کو نہیں معلوم
کچھ تجھ کو پتہ ہو تو بتا گردشِ ایام

۱۹۴۷ء

مناجات

تیری سرکار میں اے خالقِ آثارِ حیات
عرض یہ واز ادب سے ہے طلبگارِ حیات

اے خدا مجھکو عطا کر دے وہ چشمِ بینا
جس سے روشن ہوں مری ذات پہ اسرارِ حیات

حمد کے ساتھ ہو توصیف محمدؐ لب پہ
اور ہو مدح علیؑ لہجۂ گفتارِ حیات

ہو لبوں پر مرے توصیف بتولِؑ عذرا
اور تعریف حسنؑ سے ہو سروکارِ حیات

مدح شبیرؑ ہو اصحاب اور اولاد کے ساتھ
ہے یہی اصل میں سرمایۂ آثارِ حیات

سامنے جلوۂ مہدیؑ زماں آجائے
توڑ کر پھینک دوں قائم ہے جو دیوارِ حیات

سرفرازی کی تمنّا میں جھکا دوں سر کو
خاک بن جائے درِ یار کی دستارِ حیات

ہر نفس دم میں بھروں الفتِ شبیریؑ کا
منجلی مجھ پہ ہوں انسان کے اسرارِ حیات

زندگی بھر غمِ شبیرؑ سے رکھوں رشتہ
اسطرح دل میں کھٹکتا رہے اک خارِ حیات

صحنِ گلشن میں لبِ لالہ و گل سے سیکھوں
نرمیٔ لہجۂ و رنگینیٔ گفتارِ حیات

خونِ شبیرؑ کے صدقے میں عطا کردے مجھے
گرمیٔ حسنِ عمل گرمیٔ بازارِ حیات

مرتے دم تک میں رہوں پیروِ ابنِ زہراؑ
جس کا کردار ہے آئینۂ ایثارِ حیات

از پئے حضرتِ پیغمبرؐ و آلِ اطہار
گامزن راہِ مودت میں ہو رہوارِ حیات

داغ یہ ماتمِ شبیرؑ کا ہم صورتِ گل
تا ابد یونہی رہے زینتِ گلزارِ حیات

۱۹۵۹ء

دل کا خواب

عہدِ ماضی میں کوئی فصلِ بہار — گُل بدامن و گلستاں بکنار
جانب دشت بھولی بھٹکی ہوئی — چاکِ دامن سے میرے اٹکی ہوئی

اپنی روداد کہنے آئی تھی
روتے روتے وہ مسکرائی تھی

عہدِ ماضی میں کوئی فصلِ بہار — گُل بدامن و گلستاں بکنار
حسنِ غارتگرِ جنوں بن کر — آبشاروں کا اک فسوں بن کر

گنگناتی ہوئی رجھاتی ہوئی
فتنہ ہائے جہاں جگاتی ہوئی

عہدِ ماضی میں کوئی فصلِ بہار — گل بدامن و گلستاں بکنار
مری تقدیر کا اڑانے مذاق — بن کے افسانہ خوانِ دردِ فراق

صاعقہ وش مثالِ شبنم صبح
دے گئی مجھکو گوہرِ نم صبح

عہدِ ماضی میں کوئی فصلِ بہار — گل بدامن و گلستاں بکنار
صورتِ خوابِ لذّتِ ہستی — آئی اور آکے مجھ سے روٹھ گئی

اپنی تقدیر اپنی قسمت ہے
دل میں داغِ غمِ محبّت ہے

۱۹۵۵ء

گلِ تر

اے رازدارِ موسمِ گل جانِ گلستاں — خاموش تو ہے ہوتا ہے ہر جا ترا بیاں

محفل میں، آستانوں پہ اور خوابگاہوں میں — تیری پہونچ ہے اے گلِ گلشن کہاں کہاں

نذرانۂ عقیدت و اخلاص تیرا ہار — تیرا وجود باعثِ تنشیطِ جسم و جاں

مرنے کے بعد تجھ سے مزاروں کی رونقیں — تازہ ہے تجھ سے تذکرۂ یادِ رفتگاں

بنتی ہیں دیکھ ہر غمِ امروز کا حجاب — پروردۂ بہار تری خوش نمائیاں

سائنس داں ہیں حلقہ بگوشوں میں تیرے آج — تجھکو سمجھ کے فطرتِ موسم کا رازداں

قیدِ سکوت میں تجھے آزادیاں نصیب

تو چپ ہے، اور ہم ہیں اسیرِ چنیں چناں

۱۹۶۳ء

ملت کی بے بسی

ملتِ بیضا کی تہذیب و تمدن کا مزار — غیر قوموں کے تمسخر کی زیارت گاہ ہے

مٹ گیا احساسِ خودداریٔ ملت اس قدر — رزمِ مسلم عظمتِ مسلم سے لاپرواہ[۱] ہے

منزلِ مقصود کا کوسوں پتہ چلتا نہیں — کارواں رہبر بغیر اس دور میں گمراہ ہے

مختصر یہ ہے کہ روئداد تباہی کا مآل

بہرِ تسکینِ دلِ زار ایک حرفِ آہ ہے

۱۹۶۰ء

۱؎ یوں بھی مستعمل ہے۔

ہجویات[1]

شہرت کے پجاری[2]

مغرور و تہی مغز و بد انجام و بد اطوار
شہرت کے پجاری یہ گدائے غم اشعار

تقریر سے عاری ہیں تو تحریر سے عاری
تحریص کے جنگل کے یہ چنڈول شکاری

کم ظرف و زبوں طینت و بد باطن و جاہل
تعمیر کے دشمن ہیں یہ تخریب پہ مائل

نافہم، ادب سوز، جفا ساز، ستم جو
جھوٹے ہیں دغا باز یہ بوجہل کے بھٹو

بگڑے ہوئے افراد سے یہ کام بنائیں
سلطانِ خباثت کے جو احکام یہ پائیں

شاعر ہیں کہ ہیں دزدِ مئے ساغر کہنہ
محفل میں ذرا دیکھ لیں آپ ان کا بھی حلیہ

چوروں کی طرح چپ ہیں مگر اکڑے ہوئے ہیں
بندھن میں جہالت کے ابھی جکڑے ہوئے ہیں

سارق ہیں مضامیں کے خیالات کے قزاق
اور فنِ خوشامد میں زمانے میں ہیں یہ طاق

تحریک کے بل بوتے پہ تعریض کے فرزند
یہ شاہدِ تخئیل کو کرتے ہیں نظر بند

اندازِ بیاں ان کا ہے محتاج غنا کا
گھنگھرو ہے جو ہے دست نگر جنبشِ پا کا

تعریف غلط ان کی جو کی جائے سرِ راہ
خوش ہو کے مچل جائیں گے کم عقل و تہی جاہ

سنتے ہیں جنوں میرؔ کا جب رنگ پہ آیا
دامن کو گریبان سے شاعر نے ملایا

بھرنے کی سوانگ ان کے بھی تدبیر وہی ہے
رنگ اُڑ گیا ہے اصل میں تصویر وہی ہے

۱۹۵۸ء

[1] نذرِ سودا دہلوی (تجدیدِ فنِ ہجونگاری)

[2] دیارِ شاعری کے گداگروں کے نام

ناموس فروش[1]

طالبِ جاہ و منصب و عزّت — ایک مردِ حقیر و بد طینت

بے ادب، بدکلام و بد باطن — خود نما، خود پسند و کم ہمّت

بے حیا، بے شعور و بے ایماں — دشمنِ رب، مخالفِ سنّت

خود پرستی میں شہرۂ آفاق — کینہ جوئی میں مرد زن خصلت

بہر شہرت بنا لیا جس نے — پیشہ مفروضہ قوم کی خدمت

مقصد اس کا حصول عزّت و زر — ساری دنیا کی اس پہ ہے لعنت

ہے یہ احساس کمتری کا شکار — چاہتا ہے امیروں کی صحبت

بندۂ اہل زر وکیلِ ہوس — ہے یہ ابلیس ہی کا ہم طینت

یہ پڑھا لکھا جاہل و مجہول — کم نسب کم سواد بد قسمت

یہ ہے فرعون وقت دشمنِ حق — اسکو حق گوئی کی نہیں عادت

نفس کا اپنے یہ پجاری ہے — فتنہ پرور ذلیل خر طینت

چاہتا ہے کہ یہ بڑا بن جائے — چاٹ کر کفشِ صاحب دولت

نہ بڑا بن سکے گا یہ مردود
قبر میں جائے گا بہ ایں حسرت

۱۹۴۱ء

[1] عزّت اور شہرت کے بوالہوسوں کے نام

ابن الوقت[1]

اے مری ملت کے غدارو تمہیں میں کیا کہوں
جھوٹی شہرت کے طلبگارو تمہیں میں کیا کہوں
سونے چاندی کے پرستارو تمہیں میں کیا کہوں
حضرت ابلیس کے پیارو تمہیں میں کیا کہوں

ننگِ دینِ حق ہو تم اور ننگ آلِ مصطفےٰ
عرصۂ محشر میں وجہ انفعالِ مصطفےٰ

بیچ دو توقیرِ ملت کو برائے مدعا
تمکو جائز ذلتِ احکامِ شرعِ کبریا
چند اداروں میں تمہیں گھسنے کا موقع کیا ملا
مفت میں تم بن گئے لوگوں کے فرضی رہنما

ہر ادارہ قوم کی اک مستقل تعمیر ہے
تم سمجھتے ہو تمہارے باپ کی جاگیر ہے

صاحبِ توقیر فرضی قوم کے رہبر بنو
جیب سے پیسہ نہ جائے اور تم ممبر بنو
قوم کی کھیتی کو چرنے کے لئے تم خر بنو
ہر ادارے کے لئے اک برقِ غارتگر بنو

مذہبِ پیغمبرِ اسلام کی ذلت ہو تم
یعنی ابن الوقت جھوٹے قائدِ ملت ہو تم

[1] مفاد پرستوں کے نام

ہے تمہاری زندگی کا ہر طریقہ جب غلط — کلمۂ توحید جو رسماً ہے زیرِ لب، غلط
دین کیسا دین کے ارکان کیسے۔ سب غلط — یا مسلماں تم نہیں ہو یا ہے یہ مذہب غلط

مذہبِ اسلام آئینِ عمل کا نام ہے
اسکی پابندی بہر عنوان مشکل کام ہے

دیں کے بنیادی اصولوں سے ہے تمکو انحراف — تم الکشن باز[س] مذہب کو ہے اس سے اختلاف
جب تمہیں منصب کی خواہش ہے پئے لاف و گزاف — کیا تکلف ہے مجھے کہتا ہوں میں بھی صاف صاف

سنتِ اعدائے پیغمبرؐ کے جب وارث ہو تم
ابن ملجم لعین اور اپنے وقت کے حارث لعین ہو تم

آیا پیشے پہ زوال آیا ہے اب لیڈر بنو — شوق سے ابلیس کا عالم میں تازہ شر بنو
جاگی حسِ کمتری! اللہ کے ہمسر بنو — رات بھر میخوار مردِ باخدا دن بھر بنو

شادئ آسودگئ ذوق ہر لحظہ سجاؤ
اپنے خرپٹھوں کو لیکے قوم کی کھیتی چراؤ

تم وہ اُلّو ہو جو دن کو آشیانہ چھوڑ دے — رشتۂ پیمانِ فطرت کو جو بڑھ کر توڑ دے
کیوں نہ پھر شہپر تمہارا شاخِ صحرا موڑ دے — کاوشِ حرص آفریں کو بخت بد میں گوڑ دے

مرکبِ ابلیس بن کر رات دن مارے پھرو
دشتِ حرص و آز میں تم بن کے بیچارے پھرو

۱۹۶۲ء

س۔ وہ لوگ جو حصولِ اقتدار کے لئے دین کو پسِ پشت ڈال کر الکشن کے داؤں پیچ کا دھندا کرتے ہیں۔

غدّارِ قوم[1]

خادمِ قوم غمِ قوم کے بھوکے تم ہو
پیاسے ہمصورتِ قابیل لہو کے تم ہو
یوں طلبگار فقط نام و نمو کے تم ہو
غصّہ اپنوں پہ ہے تو لال بھبھوکے تم ہو

قوم برباد ہو یا قوم کے افراد تباہ
تمکو کچھ عار نہ اس میں ہے نہ کچھ خوفِ گناہ

کام جو کرتے ہو وہ کرتے ہو مقصد کیلئے
حاشیہ چاہیئے کچھ نام اب وجد کیلئے
تم تو پیدا ہوئے عالم میں فقط کد کے لئے
یہی سامان ہے تنہائیٔ مرقد کیلئے

ذہن ہے خانۂ ابلیس جو بیکاری میں
تم بھی اس دور میں یکتا ہو ستمگاری میں

خالی از عقل جو ہے بات وہی کرتے ہو
جس پہ سب کہتے ہیں ہیہات وہی کرتے ہو
جو کہ رسمی ہے ملاقات وہی کرتے ہو
جس سے ہو ترکِ موالات وہی کرتے ہو

تم تو من مانے ہو دیوانے ہو دیوانے ہو
قوم اندھی ہے تو اس قوم میں تم کانے ہو

ظلم کو تم نے سمجھ رکھا ہے جز و فطرت
اس سے ملتی ہے دلِ نحس و نجس کو فرحت
تم بدل سکتے نہیں اپنی پرانی عادت
تمکو کیا فکر کریں لوگ جو تم پہ لعنت

افتراق ایسا وطیرہ ہے تمہارا ہی شعار
مردکِ وقت ہو سر میں ہے حکومت کا خمار

۱۹۶۴ء

[1] قوم کے سچے خدمتگزاروں اور دردمندوں سے معذرت کے ساتھ

ملّا اور اولاد ملّا

(مذہبی ظاہردار بیگوں کے نام)

یہ پرستارِ روایات یہ زر کے بندے
آبرو باختہ ہیں لعل و گہر کے بندے

جب کبھی فتنۂ ابلیس کی شہ پاتے ہیں
محرکت میں یہی پتھر ہیں جو آجاتے ہیں

مال و اعزاز کو دولت کو خدا کہتے ہیں
پوچھئے ان سے یہ اللہ کو کیا کہتے ہیں

ننگِ اخلاق و شرافت ہیں بحدِّ لعنت
کسب زر ان کے لئے قوم و وطن کی خدمت

نہ سیر پر نہ مغازی پہ نظر رکھتے ہیں
یہ جواری ہیں تو بازی پہ نظر رکھتے ہیں

حق کو مدخولۂ تقریر سمجھ بیٹھے ہیں
دین کو باپ کی جاگیر سمجھ بیٹھے ہیں

منبرِ سید لولاک پہ آسن دیکھو
حرمِ پاک پہ قابض ہے برہمن دیکھو

دیں کو بازیچۂ کفر آکے بنانے والے
کفر کو دین کی مسند پہ بٹھانے والے

یہ ہیں مقتولِ عمل بات کے غازی ملّا
آیۂ وَیْلٌ[1] کے مصداق نمازی ملّا

۱۹۴۲ء

[1] فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ (قرآن مجید)

خود پسند متشاعر[1]

اک مردک کم ظرف و کم آگاہ و بلا نوش — فردا کی جسے فکر نہ ہے جس کو غمِ دوش
خود بین و بد اطوار و تہی مغز و غلط گام — بد طینت و بد باطن و بدخواہ و بد انجام
پروردۂ آغوشِ فریب انجمن آرا — آوردۂ جہالِ ادب مکر کا پُتلا
اک حاسدِ ناکام ستائش کا پجاری — اک شاعرِ بدمست فنِ شعر سے عاری
یہ پوپلا، گلگینڈا ہے کم ظرف ہے کٹ بٹ — شعر اس کا لچر پوچ تو ہے قافیہ چوپٹ
جو پوربی بھاشا کو کرے اُردو میں داخل — اور اُردو میں ہندی کی ہو تحریر پہ مائل
تقدیر اُسے لاٹری اُردو کی دلائے — اور لکھ پتی سنسار میں مشہور کرائے
یہ وقت کا فرزند جماعت کے سہارے — جو آگے بڑھا مفت کی شہرت کے سہارے
لونڈوں کی یہ صحبت میں رہا کرتا ہے ہر دم — کم علموں میں شہرت کے تصاویر کا البم
جب شعر پڑھے بزم میں اس بھانڈ کو دیکھو — پھیلا ہوا منھ اور پھٹی آنکھ تو دیکھو
بہروپ میں وہ روپ کہ شیطان کا جگر بند — خود اپنے مفادات کی پیلو ٹھی کا فرزند
تہذیب کی "ت" سے نہیں آگاہ ہے مردک — راہِ سخن و شعر کا گمراہ ہے مردک
ہر بزم ادب میں سبب بے ادبی ہے — تنقید کا دھندا پئے شہرت طلبی ہے

شاعر تو کوئی بونڈوں میں یوں عام نہ ہوگا
'بد نام اگر ہوگا تو کیا نام نہ ہوگا'

[1] ادبی اسمگلروں کے نام

اک مجموعۂ بے ربط کا یہ شاعرِ مغرور
پابندیٔ فنِ سخن و شعر سے مجبور

کم علم ہے باطن میں تو ظاہر ہے یہ عالم
اس آرٹ کی دنیا میں یہ اخلاق کا مجرم

ہر شاعرِ خوش گو پہ یہ تعریض کا عادی
ہے محفلِ فنکار کا مشہور فسادی

پوشیدہ حقیقت پہ کئی پردے پڑے ہیں
درشن تو یوں چھوٹے ہیں مگر نام بڑے ہیں

گہہ کیٹس کبھی شیلیٔ دوراں یہ بنے گا
اکڑے گا بنائے گا یہ منہ اور تنے گا

مجموعۂ اغلاط ہے بدگو ہے غلط کار
تعریف سے اپنی اسے رہتا ہے سروکار

غالب کا حریف اور ہے کلیان[۱] سے کمتر
اقبال کا بنتا ہے کبھی میر کا ہمسر

یہ ملزمِ بالغ نظری پیرِ خرابات
خود اپنی ہی تعریف کیا کرتا ہے دن رات

نامحرمِ اسرارِ زباندانیٔ محمود
یہ ہمسرِ اربابِ سخن بنتا ہے بے سود

آوارگیٔ ذہن و سفاہت کا ہے سنگم
کرتا ہے فراقِ رخِ محبوب کا ماتم

بے بہرہ ہر اک بحر سے مجہولِ معانی
شعر اس کا ہے سنڈاس کا ٹھہرا ہوا پانی

نانی ہے کہانی کی کہ ہے بنتِ لطائف
بازارِ ادیباں کی گراں عمر طوائف

یہ مسخرۂ بزمِ سخن نقشۂ عبرت
آمادہ گنوانے پہ ہے پائی ہوئی عزت

ہے اسکی تعلّی میں حماقت کی تجلّی
بنتا ہے بڑا دیکھ کے شہرت کی تجلّی

وقت آئے گا جب اسکی حقیقت بھی کھُلے گی
ہر جنسِ سخن علم کی میزاں میں تُلے گی

۱۹۶۲ء

۱؎ غالب کا ملازم

شکایتِ روزگار

معروضہ

اے خداوندِ جہاں خالقِ اکبر سن لے	صاحبِ قدرت و معمارِ مقدر سن لے
واقفِ نفسِ بشر داورِ محشر سن لے	میرے معروضہ کو بھی بہرِ پیمبر سن لے

کیا کروں میں کہ ترے بندے بہ رنگِ ابلیس
کرتے ہیں ظلم کے پھر تازہ ادارے تاسیس

تیرے بدنام کنندوں نے بہ اندازِ جدید	کھول رکھی ہے زمانے میں دکانِ تہدید
خلق پہ ہوگیا صد حیف روا ظلم شدید	دورِ حاضر میں نظر آتے ہیں فرعون و یزید

بندگی رہ گئی ہاتھوں سے خدائی نہ گئی
مر گئے لاکھ بُرے پھر بھی بُرائی نہ گئی

نام پہ مذہب و ملت کے حکومت کا خیال	ہے خزانوں کی تمنّا انھیں دولت کا خیال
پاس آتا نہیں ایمان کی عزت کا خیال	کبھی پجنے کا تصوّر کبھی شہرت کا خیال

مدعیٔ بندگیٔ حق کے بنے ہیں خود سر
پیروی مسلکِ ابلیس کی کرتے ہیں مگر

جو اندھیروں کے عوض بیچیں اُجالے تاجر ۔ چور بازاری کے ماحول کے پالے تاجر
ساری دنیا سے الگ سب سے نرالے تاجر ۔ یہ شہیدوں کا لہو بیچنے والے تاجر

ذات پہ جنکی تھا موقوف مدارِ ملت
بیچتے ہیں وہ کھلے عام وقارِ ملت

اہلِ جنت کا وہ سردار قتیلِ خنجر ۔ وارثِ مسندِ پیغمبرِ دینِ داور
مرکزِ ظلم و ستم فاطمہؑ زہرا کا پسرؑ ۔ آج بھی دہر میں مظلوم ہے ابنِ حیدرؑ

دعوئ بندگئ سرورِ دلگیر کے ساتھ
لوگ کرتے ہیں ستم عاشقِ شبیرؑ کے ساتھ

ڈال کر دوش پہ ایمان کی چادر آئے ۔ مجلسِ شاہِ شہیداں میں مکرّر آئے
کتنے رہزن ہیں جو ہمصورتِ رہبر آئے ۔ آستینوں میں چھپائے ہوئے خنجر آئے

کوئی کہتا ہوا گذرا ہے ’نہو رسوائی‘
”بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی“

شاعر و مولوئ و مفتئ دین و ذاکر ۔ مکر کے فن میں بہر طور ہیں پورے ماہر
اپنے کردار اور اخلاق کے اوچھے تاجر ۔ ظلم سے باز نہیں آتے یہ آخر آخر

کیا ترے ماننے والوں کے یہی ہیں انداز
حق اگر یہ ہے تو اس حق سے تو آیا باز

۱۹۷۱ء

ریاکار[1]

(۱)

یہ زائرینِ ریا دوست کم سواد فقیہہ
یہ ننگِ قوم[2] و وطن خود سرانِ بے تنبیہہ

تقیہ خانۂ اغراض میں ہے آویزاں
یزید و شمر و بن سعد و حرملہ کی شبیہہ

ہر ایک خدمتِ قومی برائے نام ہے یا
لا اُختہ لا اخیہ لا اُمّہ لا ابیہ

یہ کاروبار کہ ہے جس کا نام خدمتِ قوم
ہے سودمند بہت ساتھ ساتھ سخت کریہہ

جنونِ خدمتِ ملت ہے یا شہنشاہی
یہ ایک رمز ہے جسکی نہ ہو سکی توجیہہ

(۲)

نفاقِ کل کے ہے قبضے میں خرقۂ اسلام
لٹیرے عصمتِ کعبہ کے پھر رہے ہیں تمام

صنم پرست حرم کے قریب پہونچے ہیں
تراشے جاتے ہیں اپنی پسند کے اصنام

نہ جانے کتنے مسلماں نما منافق آج
وقارِ کعبہ کو لوٹیں گے باندھ کر احرام

انھیں کا قول انھیں کا عمل ہے مذہبِ دیں
خدا کہاں کا کہاں کے رسولؐ کیسے امام

خدا کرے کہ خدا سے کوئی کہے جا کر
کہ تجھکو حرص کے بندوں نے کر دیا بدنام

(۳)

ہوئی ہے قومی اداروں کی ہر جگہ تاسیس
برنگِ خدمتِ ملت ہے فتنۂ ابلیس

خدا کی شان کہ ارباب کم نژاد و حقیر
بنے ہیں قومی اداروں کے مفت خورہ رئیس

۱؎ ریاکار زاہدوں، حاجیوں، زائروں، قومی خادموں اور جملہ ریاکاران جہاں کیلئے علامتی تازیانۂ ملامت۔

رہِ حیات میں الیاسؑ و خضرؑ لٹتے ہیں | کہ رہبرانِ زمانہ ہیں مائلِ تلبیس
فریب ان کی حیاتِ رکیک کا مقصد | کہیں یہ زُور کہیں مکر اور کہیں تدلیس
انھیں عزیز ہے شہرت کسی طرح سے ملے | یہ اپنے جذبۂ خدمت کی چاہتے ہیں فیس
خدا ہی خیر کرے اہلِ قوم کے ہاتھوں | پڑی ہے خطرے میں کردار قوم کی تقدیس

(۴)

یہ بدنصیب ہیں احساس کمتری کے شکار | کہ ان کے پیشِ نظر ہے نمود و نام و وقار
کسی طرح سے کوئی ان کو جان لیتا کاش | یہ آرزو ہے کہ مشہور ہوں دیار دیار
لہو حسین علیہ السلام کا ہے چین | اگر ہو عزتِ مشروط کے لئے درکار
یہ حوصلہ کہ ہوں ملت کے حکمراں کم بخت | برس رہی ہے رُخِ نحس و شوم پر پھٹکار
کبھی ہم انکو تو خاطر میں لا نہیں سکتے | یزیدیت کا تصوّر بھی ذہن پر ہے بار
حسینؑ ابن علیؑ کے ہیں ماننے والے | رہے گا بیعتِ کم ظرف سے ہمیں انکار

۱۹۶۸ء

سند یافتہ جاہل، سخن ناشناس شاعر، بیگانۂ تنقید ناقد[۱]

یہ کم سواد سفلہ طبیعت سند بکف | ننگِ وجود بہر حسد موجب شرف
خوش ہیں کہ ہیں یہ ناوکِ تعریض کے ہدف | اربابِ علم و فن کے یہ بے ضابطہ خلف
شاعر نہ بن سکے تو سخن زاد بن گئے | اپنے وجودِ نحس کی فریاد بن گئے
اردو کے واسطے ستم ایجاد بن گئے | گستاخیٔ مزاج کی افتاد بن گئے

[۱] ایسے تمام لوگوں کے نام جو دوسروں کے قلعہ عظمت کی اینٹوں کو چرا کر اپنی سستی شہرت کی جھونپڑی بناتے ہیں۔

باہر تنوں سے نکلے تو صیاد بن گئے
مہمل نگاریوں کے یہ استاد بن گئے
سننے میں آرہا ہے کہ نقاد بن گئے
اس دورِ انتشار کی روئداد بن گئے
ہو کر یتیم دہر میں کیا د بن گئے
ژاں۔ پال سارتر کی خود اولاد بن گئے

یہ کم سواد سفلہ[1] طبیعت سند بکف
ننگِ وجود بہر حسد موجبِ شرف

۱۹۶۳ء

انجامِ انتشار

جو زہرِ معنیٰ کو ہضم کر کے زمینِ اشعار میں گڑے ہیں
وہ اپنی تنہائیوں کی قبروں میں بے کفن آج تک پڑے ہیں

جو چاہے کوئی مسیحِ عصران میں روح پھونکے تو بے نتیجہ
گھناؤنے ہو چکے ہیں چہرے بدن کے اعصاب تک سڑے ہیں

اور انکی کمزور نسل کے نامراد مسکین یتیم بچّے
دیارِ لامقصدیت انتشار میں آج چپ کھڑے ہیں

یہ یاس زدگانِ عہدِ حاضر فرار کے شہر کے مہاجر
رہِ عدم کے نئے مسافر وجود سے اپنے خود لڑے ہیں

بشر سے بیزار خود سے عاجز نہ جی سکیں گے نہ مر سکیں گے
حماقت اس پہ کہ اپنی ہٹ پہ یہ عورتوں کی طرح اڑے ہیں

۱۹۶۲ء

[1] سفلہ ایک مشہور مفکر اور ادیب

سُن تو سہی[۵۱]

اے مرے جذبۂ ناکام کے نازک احساس — کیا کروں تجھ کو زمانے کی ہوا آئی نہ راس
نکتہ چینی کے لئے رہ گئے اہلِ وسواس — (۱) لُٹ گئی عصمت صاحب نظراں سُن تو سہی !

اب نہ گلچیں ہے نہ بلبل ہے نہ گُل ہے نہ تو باغ — اُٹھ گئی بزم بجھے مشعل و فانوس و چراغ
سرد ہے میکدۂ حُسن کہ خالی ہیں ایاغ — (۲) رہ گئی تشنگیٔ بادہ کشاں سُن تو سہی !

عالم آشوب یہ انسان کی خود رائی ہے — کتنے معصوموں نے بے وجہ سزا پائی ہے
سُنتے ہیں حُسنِ جہاں سوز پہ آنچ آئی ہے — (۳) ایک ہنگامۂ ناقوس و اذاں سُن تو سہی !

گونجتی ہے یہی صحرا میں صدائے پیہم — وائے بر حالِ غریبانِ محبت ہمدم
کون کہہ سکتا ہے ارباب وفا کا عالم — (۴) داستانِ غمِ آشفتہ سراں سُن تو سہی !

(۱۹۵۹)

مردانِ سفلہ طبع بہر جا چنیں کنند[۵۲]

شاگرد بے ادب ہے کہ مقروض نادہند؟ — احسانِ ناشناس ہے یا مردِ خود پسند؟
گذرا ہے کون سامنے سے صورت آشنا؟ — بیگانہ وار دیدۂ اخلاص کر کے بند؟
تہذیب چیخ اُٹھی فغانِ کرم کے ساتھ — اک سرد آہ عزت آدم نے کی بلند
بہر سلام پھر بھی نہ ہاتھ اُس کے اُٹھ سکے — احساس کمتری سے کچھ ایسا تھا بہرہ مند
گھر آنسوؤں نے چشم شرافت میں کر لیا — پہونچا ضمیر فطرتِ انساں کو وہ گزند
یہ کہہ کے حلم نے مجھے خاموش کر دیا — مردانِ سفلہ طبع بہر جا چنیں کنند

(۱۹۶۰)

۵۱ بے حس افرادِ ملت کے نام — ۵۲ بدطینتوں کے نام

بابِ نو

اُردو کا احتجاج

اشکِ خوں دیدۂ پرنم سے بہا کر دیکھا
روکے خود بزم میں ہر اک کو رُلا کر دیکھا
شاہ جمہور کی سرکار میں جا کر دیکھا
اپنا افسانۂ غم خیز سُنا کر دیکھا

دادرس کوئی نہ غمخوار نظر آتا ہے
ہر کوئی در پئے آزار نظر آتا ہے

میں نے تہذیب سکھائی ہے شرافت دی ہے
میں نے اخلاق و مساوات کی نعمت دی ہے
آدمیت کی اخوت کی لطافت دی ہے
حد یہ ہے ذہن کو احساس کی لذت دی ہے

مجھ سے منہ پھیر لیا تم نے یہ کیا کر ڈالا
سچ اگر پوچھئے ہو خون وفا کر ڈالا

قصۂ حسن میں، عشاق کے افسانے میں
گوردوارے میں، مساجد میں، صنم خانے میں
بزم میں، رزم میں، میدان میں، میخانے میں
شہر میں، راہ میں، گلزار میں، ویرانے میں

وجہ اظہارِ خیالات مری ذات رہی
ملک میں میرے سبب رسم ملاقات رہی

آمد و رفت مری تھی غرباء کے گھر میں
بے جھجک سے سکھ سے رہی میں امراء کے گھر میں
عام لوگوں کے گھروں میں عُلمائ کے گھر میں
بادشاہوں کے محل میں سفراء کے گھر میں
میری ہر ایک جگہ عزت و توقیر ہوئی
آج وہ دن ہے کہ میں موجب تعزیر ہوئی

میں صحافت کی ادب اور ثقافت کی امیں
مدتوں تک رہی اسرارِ سیاست کی امیں
ہندو و مسلم و سکھ سب کی محبت کی امیں
لوگ کہتے تھے مجھے عصمت بھارت کی امیں
دیدۂ چرخ نے دیکھے نہیں تم سے عیار
میں نہ غدار ہوئی بن گئے تم خود غدار

چاند سورج جو ہیں شاہد تو ستارے ہیں گواہ
رات دن وقت کے مڑتے ہوئے دھارے ہیں گواہ
انقلابات کی آنکھوں کے اشارے ہیں گواہ
سب کے سب مختصراً یہ کہ ہمارے ہیں گواہ
ایک فہرست کہ جو آئینۂ احساں ہے
انقلابات کے ہر موڑ پہ آویزاں ہے

ہندو و مسلم و سکھ ایسے ہیں میرے فرزند
جن کے دل میں ہے مری آج محبت دو چند
جو کسی طرح نہیں جادۂ ایثار میں بند
ڈال سکتے ہیں جو ہر بام مظالم پہ کمند
کب فقط زلفِ سخن تک یہ پہونچ سکتے ہیں
وقت پر دار و رسن تک یہ پہونچ سکتے ہیں

۱۹۴۸ء

چھبیس جنوری

تقدیر انقلاب ہے چھبیس جنوری — جمہور کا شباب ہے چھبیس جنوری

صد مرحبا کہ تیرے عزائم کے سامنے — ہر ظلم آب آب ہے چھبیس جنوری

تھا ملک میں جو باہمی فرقوں کا اختلاف — ان سب کا سدِّ باب ہے چھبیس جنوری

رندانِ اتحاد و مساوات کے لئے — جامِ شرابِ ناب ہے چھبیس جنوری

تاریخِ حریت کا زبانِ عوام میں — اک یادگار باب ہے چھبیس جنوری

عہدِ عمل کے عزم فراواں کا روز ہے
چھبیس جنوری نئے ارماں کا روز ہے

یہ کیا کہ مقصد ایک مگر اختلاف ہے — یہ کیا کہ بھائی بھائی میں باہم مصاف ہے

یہ کیا کہ ناز کرتے ہیں اجداد پہ فقط — یہ کیا کہ جھوٹ موٹ کی لاف و گزاف ہے

یہ کیا کہ اعتراض کے فیشن کا ہے رواج — یہ کیا کہ فردِ جذبِ تعاون ہی صاف ہے

یہ کیا کہ اپنے ملک کا کرتے ہیں راز فاش — یہ کیا کہ ہمکو حوصلۂ انکشاف ہے

یہ کیا کہ مے پرست مکیّف نہیں ہنوز — یہ کیا کہ بادۂ عمل آبِ مضاف ہے

یہ کیا کہ ہیں سکوت میں اربابِ حل و عقد — یہ کیا کہ کم نگاہِ وطن نکتہ باف ہے

یکجہتی، اتحاد و محبّت کے واسطے
کوشش ہے شرط وحدتِ ملّت کے واسطے

لفظوں کا رنگ حسنِ معانی نکھار دے
گلزارِ اعتبارِ تمنا بہار دے

اے نوجوان مادرِ ہندوستاں کے لال
اقصائے ہند میں یہی اُٹھ کر پکار دے

مزدور اور کسان ہر اک اپنے طور پہ
تقدیرِ ملک اپنے عمل سے سنوار دے

اے صاحبِ ارادہ و عزمِ شباب مند
جمہوریت کو سلسلۂ استوار دے

باغِ ترقیات کو اے صاحبِ قلم
حسنِ بہارِ کلکِ زمرد نگار دے

بھارت میں بھکمری کے غریبی کے دیو کو
پیکانِ قدرِ عظمتِ محنت سے مار دے

ہاں اے امینِ دولتِ ہمت وطن کی آن
اب تک ادھار لیتا رہا اب ادھار دے

غیرت پسند فرض یہ ہے خود کفیل بن
راہِ ترقیات میں تو سنگِ میل بن

۱۹۷۳ء

چاہیے

قوم کو پھر مرکزِ ایماں پہ آنا چاہیے
کربلا کو مستقر اپنا بنانا چاہیے

سعیِ مشکور اہلِ ایماں کی ہے اک جنسِ گراں
اس کو بازارِ عمل میں جلد آنا چاہیے

دار پہ چڑھ کر خوشی کے ساتھ میثم کی طرح
ساری دنیا کو پیامِ حق سنانا چاہیے

عصمتِ انساں کے رہزن پھر رہے ہیں چار سو
آبرو ایمان والوں کی بچانا چاہیے

یہ وہ موقع ہے کہ تج کر اپنا آرام اور عیش
منزلِ دارِ عمل کی سمت آنا چاہیے

خوابِ خرگوش آج اک افسانہ بن جائے اگر
سوچ لیں ہم اپنا مستقبل بنانا چاہیے

۱۹۵۹ء

روٹی اور شاعر

روٹی

دم سے قائم ہے مرے گرمئ بازار جہاں
قدر آگاہ ہیں میرے جو ہیں دانائے زماں

ماہ تاباں کو بھی درکار ہے تشبیہہ مری
دفترِ شعر، شہادت کو ہیں حاضر دیواں

عشق کو میں نے عطا کر دیا احساس و شعور
میرا ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ حسنِ خوباں

نان کہتے ہیں مجھے عشق کی حاکم ہوں میں
اور ہوں میں نمکِ حسن کی تنہا نگراں

میرے حربے ہیں شہنشاہی و جمہور سبھی
ہے سیاست مری پوشیدہ کبھی ہے عریاں

تفرقے ملک کے مذہب کے مٹا دیتی ہوں
مسلک میں مرے انسان ہیں سب ایک زباں

امتیازات کی تقویم ہے اک چال مری
ایک فتنہ مرا تفریقِ گدا و سلطاں

میں غمِ عشق بدلتی ہوں غمِ دوراں سے
انقلابات کی خالق ہوں فسادات کی ماں

یہ جو دنیا ہے جہنم سے بھی بدتر تجھ کو
میں جو چاہوں تو بنا دوں اسے فردوس نشاں

مقصدِ زیست سمجھتے ہیں سبھی میرا حصول
تیری دنیا میں ازل سے مرا سکہ ہے رواں

میں نے آدم کو جہاندیدہ بنا کر چھوڑا
میں نے کاشانۂ تہذیب سجا کر چھوڑا

شاعر

اے کہ پروردۂ خورشید رہینِ باراں
تیری خلقت نے اُٹھائے ہیں زمیں کے احساں

تجھکو پروان چڑھانے میں ہے دستِ دہقاں
اور مزدور بھی ہے تیرے لئے فیض رساں

حیف ہے تجھ پہ بھلا دیتی ہے سارے احساں
اُنکی آنکھوں سے بھی ہو جاتی ہے اکثر پنہاں

دخترِ خوشۂ گندم تری الفت ارزاں
جان دیتے ہیں گدا تجھ پہ تو قرباں سلطاں

تیری توصیف میں تھکتی نہیں شاعر کی زباں
تیری تعریف میں سرگرم ہیں کچھ فلسفہ داں

دیدنی موسم باراں میں ہے گاؤں کا سماں
بھوک سے جب کہ ہوں بیتاب ہزاروں انساں

لب پہ آئی ہوئی وہ بھوک سے اطفال کی جاں
ضعف سے چور زن و مرد ضعیف اور جواں

قدر تیری مجھے تسلیم مگر جانِ جہاں
اپنے بارے میں تجھے پھر بھی ہیں وہم اور گماں

مبتلا کر گیا وسواس میں تجھکو شیطاں
تو نے سمجھا ہے کہ عالم کی تو ہے روح رواں

نسل آدم کے لئے ننگ ہیں ایسے انساں
مقصد زیست سمجھتے ہیں تجھے جو ناداں

تیری تخلیق ہوئی فکر دو عالم کے لئے
اسی جنّت سے نکالے ہوئے آدم کے لئے

تجھ سے قائم ہے یہ مخلوط نظامِ تن و جاں
جسم انساں میں ہے لاریب ترا خون رواں

مقصدِ ہستیٔ انساں تو نہیں ہے روٹی!
تیرا مقصد ہے قویٰ سازیٔ جسمِ انساں

پست کا مقصد ہستی ہے کہ ہو صرفِ بلند
اس لئے تو ہوئی انساں کی خاطر قرباں

تیری ناسمجھی نباتات کا جوہر ہے مگر — وائے بر غلطی و نادانیٔ ذہنِ انساں

خود شناسی کا تھا جوہر جو اُسے کھو بیٹھا — مقصدِ زیست سمجھ بیٹھا تجھے یہ ناداں

یہ بشر اشرفِ مخلوق ہے شہکارِ خدا — ہے فقط اس کے تصرف کیلئے سارا جہاں

پیکرِ عشق یہی محرمِ اسرار بنے — ہو اگر حسنِ ازل کا کہیں زیرِ فرماں

عشقِ بیدار کا حامل ہو تو ہے عارفِ ذات — موت بھی اس کی ہے دراصل حیاتِ پنہاں

سامنے منزلِ مقصود دلِ بینا کے — عشق تاریکیٔ منزل میں بھی ہے شعلہ فشاں

صاحبِ درد، جری اور عمل کا خوگر — ہو جو آدم کا پسر ایسا وہی ہے انساں

خود شناسی ہے فقط مقصدِ ہستیٔ بشر
ہو حقوق اور فرائض پہ سدا اُس کی نظر

۱۹۵۵ء

آبگینہ

نہ کہیں جشنِ بہاراں نہ کہیں رقصِ حیات
نہ کہیں بادہ و مینا کی تپش زا منزل
مری محبوب!
تری عمر کے گذرے ہوئے ایام حسیں
جن کے پردے میں نہاں تیرا کنوارا پن تھا

عصمتِ حُسن

آبگینہ ترے جذبات کا رنگین و سبک
پردۂ چشم حجابات نظر کی وہ اوٹ
آڑ میں جسکی مچلتے ہوئے طوفانِ حیات
نقرئی باہوں میں آرام کا خوگر وہ تصوّر
کہ جیسے
کئی برسوں کی مسلسل کوشش
کھینچ لائی تھی
فلک بوس صنم خانوں سے
آبگینہ تھا نا !
ٹوٹ گیا ٹوٹنے والا ہی تھا
اب نہ وہ حُسنِ بہاراں
نہ کہیں رقصِ حیات
ہاں مگر
اک خلشِ یاد ابھی باقی ہے
تشنگی میری فقط مرحمت ساقی ہے

۱۹۴۹ء

یادوں کے سائے

وہ حسیں شام کہ جس شام کے گیسو بکھرے — دوشِ ایام کی غمازِ نزاکت کے قریب
پھول کی طرح سے ہنستے ہوئے چہرے چمکے — (۱) صفحۂ ذہن پہ تھی برقِ نظر کی تشبیب

قیس آوارگیٔ دشت سے حیران بھی تھا — اپنے ناکردہ گناہوں پہ پشیمان بھی تھا
قربِ محمل نہ تھی خلوت کہ حُدی خوان بھی تھا — (۲) عاشقِ زار تھا محروم تھا انسان بھی تھا

تاب لانا تھا محال امرِ محبت کی مگر — دعوتِ دید تھی بیتابیٔ دل کے نزدیک
اُٹھ گئی سوئے جمالِ آرزوئے دل کی نظر — (۳) ابھی سیکھی ہی نہ تھی عشق و وفا کی تکنیک

شام ڈوبی ہوئی ایوان میں تھی گیسو کے — چشم تھی تابعِ فرماں جو ابھی ابرو کے
نقش دھندلے سے تھے کچھ خال و خدِ گل رو کے — (۴) شوخیاں ڈھونڈھتی تھیں سائے نئے جادو کے

ہم کہ تھے محوِ نظارہ نہ تھا خود اپنا خیال — ہوش سے دور تھے مستی کے قریں سوئے ہوئے
بُن رہے تھے ابھی تشکیلِ خیالات کے جال — (۵) عالمِ کیف میں اسطرح تھے کچھ کھوئے ہوئے

مُسکراتے ہوئے پھولوں کے ہلے لب جس دم — ایک طوفان تھا غُل جس میں زیادہ نہ تھا کم
گفتگو بھی تھی خوشی بھی تھی لیکن مبہم — (۶) اک طرف جلوہ فروز آپ تھے اک سمت کو ہم

ٹوٹا کاشانۂ رمزِ آرزوئے دل کی طرح — اب نہ وہ ربطِ احساس نہ وہ چنگِ خیال
اضطراب اب بھی ہے اک کاہشِ منزل کی طرح — لوگ کہتے ہیں ہمیں شیفتۂ حسن و جمال

۱۹۵۸ء

اطلاع

رنگ رُخ بادۂ چشم اور سواد گیسو
چاندنی کوئی تو شب نور کوئی ہے منجو
ایک ہی پھول کے ہیں نام بہت سے لیکن
ان میں ہر ایک میں ہے ایک ہی رنگ ایک ہی بو
حسن پوش آنچلوں کے سائے سے میں ہوں اب دور
میں وہاں ہوں کہ جہاں بنتے ہیں آنچل سے کفن
خانۂ دل کو نہیں جستجوئے بدر منیر
میری پلکوں کے ستاروں سے یہ گھر ہے روشن
کسی دامن کا میں مرہون عنایت بھی نہیں
پونچھتا ہے مرے اشکوں کو مرا ہی دامن
اب شب ہجر شب ہجر نہیں بلکہ یہ ہے
تیرے گیسو کی سیاہی کی طربناک پھبن
اب ترے وعدۂ فردا کا میں محتاج نہیں
خانۂ دل میں ہے شمعِ غم دوراں روشن
تیرا غم بیچ کے کونین کا غم مول لیا
ہے سلامت مرا برسوں کا دریدہ دامن

۱۹۵۱ء

تلخ حقائق

بنامِ دیر و حرم لیڈروں کی تصویریں
بنامِ دیر و حرم شعلہ بار تقریریں

بنامِ دیر و حرم فتنہ ریز تحریریں
بنامِ دیر و حرم سو طرح کی تعزیریں

بنامِ دیر و حرم ظلم کی وہ زنجیریں
بنامِ دیر و حرم بے نیام شمشیریں

بنامِ دیر و حرم مفلسوں کی تقدیریں
بنامِ دیر و حرم سلطنت کی تدبیریں

یہ ہند و پاک کی ہے وہ سیاست پُرفن
نہ جس سے شیخ و برہمن کا بچ سکا دامن

ہر ایک ملک میں ہوتی ہے زہر افشانی
ہر ایک ملک میں ہے آج خوں کی ارزانی

ہر ایک ملک میں توہینِ ذاتِ انسانی
ہر ایک ملک میں تبلیغ کارِ حیوانی

ہر ایک ملک میں ہے شیطنت کی سلطانی
ہر ایک ملک سے غائب ہے جذبِ روحانی

ہر ایک ملک میں اعلانِ امن و آسانی
ہر ایک ملک میں در پردہ فتنہ سامانی

حذر کنم من از آئینِ دورِ چنگیزی
حذر کنم ز فروغِ نفاق انگیزی

یہ کارگاہِ جہاں ہے مقامِ بیکاری
بشر کو آج میسر ہے ذلت و خواری

جمالِ اصل ہے محکومِ حسنِ بازاری
ہے آج عشق بھی محرومِ سوزِ غفاریؓ

اسیرِ حرص و ہوا بزمِ دہر ہے ساری
معاشرہ بھی ہے پابندِ رسمِ تاتاری
نصیب خوابِ گراں سے ہے کس کو بیداری
نہ تجھ میں خوئے اخوت نہ مجھ میں خودداری

بشر ہے باعثِ تذلیلِ اعتبارِ بشر
بشر ہے آج فقط خون و گوشت کا پیکر

بشر ہے اپنے تقاضوں سے آج کوسوں دور
نیا زمانہ اسے دے گیا نیا منشور
جہاں میں پھیل رہا ہے جو جادوئے جمہور
ہے دستِ سامریِ عصرِ نو کا سب یہ قصور
کہ ذہنِ پیکرِ خاکی میں آگیا ہے فتور
بشر سماج کے بندھن سے ہو گیا مجبور
لبوں پہ مہرِ خموشی ہے دل میں شورِ نشور؟
حقیقتیں ابھی شاید ہیں چشم سے مستور

بجائے اشک زچشمم چوں خون می بارد
"غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد"

فقط اک امن کی خاطر سے عافیت کیلئے
جتن سماج نے دو چار کیا ہزار کئے
وطن سے قوم سے ابناءِ خاص جنم دئے
شراب کہنہ و تازہ کے کتنے جام پئے
نہ جانے کتنے جلائے تمدنوں کے دئے
محل ہزاروں یوں تعمیر سلطنت کے کئے
بطورِ تجربہ کچھ چاکِ سلطنت بھی سئے
نہ اس طرح بھی بنا کام جب تو پھر سنئے

کشاکشِ من و تو سے سماج گھبرایا
نظامِ کہنۂ عالم میں انقلاب آیا

ہر انقلاب ہے کمزوریوں کا پروردہ
علاجِ ہر غمِ امروز و نغمۂ فردا

حسین خواب تعیش عیوب کا پردا   ترقیوں کا تقاضا نوائے بہ کردہ
مگر پیام خرابی بھی ہے یہ در پردہ   کہ ہر ترقی ہے تخریب کی بنا کردہ
ازل سے ذہن بشر انقلاب گستردہ   خطا سے دور ہے کب یہ فساد پروردہ

فلک پہ یونہی مہ و مہر گیت گائیں گے
نہ جانے کتنے ابھی انقلاب آئیں گے

یہ ظلم و جور کا عالم جو بڑھتا جائے گا   میان بزم جہاں اک بشر وہ آئیگا
جو نور عدل سے دنیا کو جگمگائے گا   فساد و فتنہ و خونریزیاں مٹائے گا
سبق جہاں کو مساوات کا پڑھائے گا   بشر کو محرم انسانیت بنائے گا
پھریرا امن و اماں کا وہی اڑائے گا   یہ انقلاب بھی اس دم سکون پائے گا

وہ منتظر ہے زمانے کا وقت آنے دو
تمہارے دعوی الفت کو آزمانے دو

سنہ ۱۹۵۲ء

قطعہ

شام غم صبح عید بنتی ہے
شوم قسمت سعید بنتی ہے
جب خدا مہربان ہو جائے
ناامیدی امید بنتی ہے

سنہ ۱۹۵۰ء

قطعہ

خود یقیں ہو کے خدا کو جو بھلا دیتا ہے
وہ تو ابلیس ہے واللہ وہ انسان نہیں
دشمن سخت سے بھی جنگ ہے آسان مگر
اپنی تقدیر سے لڑنا کوئی آسان نہیں

سنہ ۱۹۵۰ء

تجزیۂ حیات

زندگی کا فلسفہ آساں نہیں دشوار ہے
گاہ برگِ گُل ہے یہ اور گاہ نوکِ خار ہے

زندگی کی اصل کیا ہے آج تک یہ مسئلہ
بزمِ عالم میں رہینِ گرمیٔ گفتار ہے

در حقیقت عالمِ امکاں میں انسانی حیات
موت سے ہر لمحہ ہر دم بر سرِ پیکار ہے

لوگ دنیا سے گذر جاتے ہیں ہنستے بولتے
ابنِ آدمؑ کا ازل کے دن سے یہ کردار ہے

زندگانی ہے کہ مانوسِ غمِ اُمید و بیم
زندگانی ہے کہ اک آئینۂ افکار ہے

ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں موت و زندگی
اک وجودِ باطنی اور ایک ظاہر دار ہے

زندگی فکرِ عمل فکرِ جزا کی کشمکش
یا یہ کہئے شدتِ احساس کا شہکار ہے

غم نصیب زندگی ہے غم نصیب موت بھی
غم کی قدر جاوداں سے کب ہمیں انکار ہے

آمد و رفتِ نَفَس مضرابِ سازِ زندگی
آمد و رفتِ نفس یہ چلتی ہوئی تلوار ہے

سُنبلِ آہِ جگر اور لالۂ اشکِ الم
ان سے قائم زندگی کا گلشنِ اسرار ہے

زندگی نیرنگیٔ ایام کے آئینے میں
نا اُمیدی کا مرقع ہے اُمید آثار ہے

زندگی کیا ہے شہیدِ تیغِ قرباں گاہِ فرض
فرقِ ہستی پہ لٹکتی دو رُخی تلوار ہے

ہو نہ جب انساں کی احساسِ فرائض پہ نظر
زندگی بیکار ہے بیکار ہے بیکار ہے

اے ثمرؔ انسان کے احساس نازک کی قسم
زندگی ہر دور میں خود اپنی ماتمدار ہے

۱۹۵۵ء

کباب

امینِ لذّت دل محرم زباں کہئے
کباب وہ جسے مقصودِ جسم وجاں کہئے

یہ حاملِ مزۂ تلخیٔ فراق کباب
سرورِ ذہن ودل وچشمِ اشتیاق کباب

یہ شوربے میں نہیں ہے کباب کا جلوہ
شفق کے بیچ میں ہے آفتاب کا جلوہ

شبِ وصال کی بیتابیوں کا شوق لئے
ہے خوان لطف یہ صد اہتمام ذوق لئے

ہے جیسے سینے میں الفت کا داغ جلوہ فگن
کباب ہے اسی صورت سے زیب کام ودہن

رگوں میں اس کی مسالہ ہے اسطرح پیوست
حنا سے جیسے ہو رنگیں کوئی حسیں کفِ دست

۱۹۵۷ء

بٹوا

ملا ہے خانۂ ہادی حسین[1] سے اے دل
حسین اور سبک اک بھرا ہوا بٹوا

ہم ایسے خوگرِ تمباکو وسپاری کو
نوازتا ہے یونہی حسب مدعا بٹوا

ہمارے دل سے کوئی پوچھے قدر بٹوے کی
ملی ہے نعمتِ دنیا جو یہ ملا بٹوا

اسی سے ہوتے ہیں غمہائے روزگار غلط
مسافرت میں ہے جینے کا آسرا بٹوا

ثمرؔ نہ کیسے ہوں ممنونِ چشمِ لطف وکرم
خلوص عشق کا آئینہ ہے نیا بٹوا

۱۹۵۸ء

[1] ہادی حسین مرحوم سابق تحصیلدار کنڈہ برادر خورد جناب ہادی حسن صاحب سابق اسسٹنٹ کمشنر کی محبتانہ پیشکش کے موقع پر۔

کربِ یاد

اے مری جانِ تمنا مرا بھولا ہوا خواب
میری آوازِ غزل میری جوانی کی کتاب

میرے ارمان کی اجڑی ہوئی دنیائے بسیط
میرے فردوسِ خیالات کا برباد شباب

میری تسکینِ نظر میری محبت کا چمن
گر پڑا غم کی انگیٹھی میں نظر کا سیماب

میرے خوابوں کا محل آرزوئے دل کی ندی
مرے جذبات کی قاتل مری قسمت کا سراب

انجمن سرد ہوئی رونقِ میخانہ گئی
شمعِ دل، جامِ نظر اے مری نایاب شراب

پھرتا ہوں دشتِ جنوں میں دلِ ناکام کے ساتھ
ٹکریں لیتا ہوں میں گردشِ ایام کے ساتھ

دونوں رخسار دو گیتی کے تراشیدہ ورق
پردۂ رخ ہے نظر کے لئے دشتِ لق و دق

گلشنِ جنتِ عارض میں طرب سائی خال
کفرِ کل یا حدِ امکاں میں ہے واصل بالحق

سرمہ سا نرگسی آنکھوں کی، وہ جادو نظری
دے جو ایمان کو عصیانِ محبت کے سبق

حسنِ بینی ہے کہ اعجاز کا آئینہ ہے
رخ ہے اک ماہِ دو ہفتہ جسے یہ کرتا ہے شق

دہنِ تنگ سے آواز نکلنی دشوار
لبِ جاں بخش کو بیماریٔ گل ہے لاحق

دلِ کم بخت کی نادان لگن کیا کہئے
بارِ خاطر ہے توجہ بہ سخن کیا کہئے

۱۹۵۴ء

یادِ غالب

بات ہم پر کھُلی غالب ترے مرنے کے بعد — فن جواں رہتا ہے صدیوں کے گذرنے کے بعد
ہاتھ کچھ آ نہیں سکتا ہے بغیر کاوش — موتی ملتا ہے سمندر میں اُترنے کے بعد
زحمتِ دشتِ محبت ہمیں محسوس ہوئی — پاؤں اِس وادیٔ پُر خار میں دھرنے کے بعد
ہم کو معلوم ہے انجامِ کمالِ فنکار — ڈوبنا پڑتا ہے سورج کو اُبھرنے کے بعد

سو برس بعد وہی جوشِ وفا باقی ہے
آج بھی دہر میں غالب کی صدا باقی ہے

اشک افشاں ہے سرِ بزم جو چشمِ نمناک — وہ یہ کہتی ہے کہ ہے گلشنِ ہستی پر خاک
چھوڑ کر مسلکِ تقلید و قدامت لاریب — کفر کو دین بنا سکتی ہے فکرِ بیباک
جاگ اٹھی قسمتِ میخانہ ہوئے ہیں جب سے — وارثِ دیر و حرم شیخ و برہمن چالاک
شہرِ خوباں میں اسی کے ہیں ابھی تک چرچے — ایک نخچیر کبھی تھا جو اسیرِ فتراک

قیدِ ہستی ہوئی ختم اور ملی آزادی
نقشِ غم شوخیٔ تعزیر کا ہے فریادی

روئیں جب خانۂ دل کے در و دیوار لہو — کیسے برسائے نہ پھر دیدۂ خونبار لہو
ہائے پھر غالبِ مرحوم کا آیا ہے خیال — بانیٔ حسرت پہ پھرا ہو گئے افکار لہو
رنگ بھرنے کے لئے یاس کی تصویروں میں — مانگ لیتے ہیں تمنّا کے طلب گار لہو

اس حقیقت کا پتہ ہم کو دیا غالبؔ نے
جو نہ آنکھوں ہی سے ٹپکے وہ ہے بیکار لہو

مرنے والوں سے ہوا ہائے زمانہ خالی
ہیں مگر زندۂ جاوید بقولِ حالیؔ

باغ تو باغ ضیا ریز ہیں ویرانے تک
ایک ہی نور ہے مسجد سے صنم خانے تک

کس بلانوش کا آئینۂ تصویر کھُلا
جگمگانے لگے اس دور میں پیمانے تک

صنعتِ خامۂ فنکار پہ حرف آتا ہے
لطفِ تصویر ہے بس رنگ کے اُڑ جانے تک

غنچۂ ولالہ وگل جیب وگریباں کے حدود
سیکڑوں رنگ بدلتے ہیں بہار آنے تک

آتی ہے فصل خزاں فصل بہاراں کے بعد
یاد رہ جاتی ہے انساں کی انساں کے بعد

دیکھا جس شخص نے خود شاہدِ اُردو کا جمال
وہ ہے غالب اسد اللہ سلیمانِ خیال

جسمِ پنجاب پہ موزوں وہ قبائے دکنی
روئے کشمیر پہ بکھری ہوئی زلفِ بنگال

اُس کو کس طرح کہیں ہم نہ خدائے اُردو
کر دیا جس نے عطا شعر کو معراجِ کمال

تیرا دیوان جواں فکر کی دنیا میں ہے
یہ حقیقت ہے مگر بیت چکے ہیں سو سال

عودِ ہندی ہو کہ اُردوئے معلیٰ غالبؔ
ہے ترے دل کا ہر اک نقشِ سویدا غالب

عہدِ ماضی کے مہ وسال تخیّل بر دوش
بخشتے ہیں مرے احساس کو آزوقۂ ہوش

دیدۂ دل میں ہے وہ منظرِ بزم آرائی
جب سخن فہمیٔ اربابِ سخن کا تھا جوش

بادۂ فن کے طلب گار ہیں اب تشنہ لب — اُٹھ چکی حیف بساطِ ہوسِ ناؤ و نوش

شہر دہلی میں ہے موجود مزارِ غالبؔ — شمع کشتہ کی طرح آہ مگر سرد و خموش

غالبؔ اپنی جگہ شاعر بھی مفکر بھی ہے

پیرِ میخانۂ اُردو ہے جواں پھر بھی ہے

لاکھوں شمعیں ہیں بہم ایک مزارِ غالبؔ — جگمگاتا ہے عجب طرح دیارِ غالبؔ

زندگی میں نہ میسّر ہوا افسوس مگر — بعد مرنے کے ہے دوچند وقارِ غالبؔ

اُردوئے[۱] لال قلعہ کے چمنستاں سے کہو — آج ہر باغ میں رقصاں ہے بہارِ غالبؔ

آج تک مل نہ سکی اسکی مثال اردو میں — کارنامہ بہ سرِ میرؔ ہے کارِ غالبؔ

بات جو حق ہے نظرؔ اس سے تو انکار نہیں

"ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں"

۱۹۶۰ء

کب تک رہیگی فصلِ بہاراں بہار پر

واجب ادائیگی کا ہے ساماں بہار پر — باقی ہے قرضِ تارِ گریباں بہار پر

گذرے گی کیا یہ اہلِ محبّت سے پوچھئے — ہے آجکل شبابِ حسیناں بہار پر

یہ رنگ اور اس پہ یہ شوخی یہ بانکپن — زخمِ دل و جگر کا ہے احساں بہار پر

کوئی نجومیانِ چمن سے یہ پوچھ لو

کب تک رہے گی فصلِ بہاراں بہار پر

۱۹۶۱ء

۱؎ مغل شہنشاہ کا محل جہاں کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی۔

قسم ہے

اے ذوقِ طلب ہمّتِ مرداں کی قسم ہے — اے جوشِ جنوں کیفِ بیاباں کی قسم ہے
اے گردشِ ایّام بعنوانِ ہزاراں — تقدیر کے بھولے ہوئے پیماں کی قسم ہے
تقدیر کے شاکی کو بنا خوگرِ تدبیر — اے دل تجھے تحریکِ رگِ جاں کی قسم ہے
ہر مسئلے کو مسئلہ زیست بنا دے — اے ذوقِ عمل عزمِ مسلماں کی قسم ہے
بھر خونِ اُمیدوں کا رگِ غنچۂ دل میں — تجھکو غمِ توہینِ بہاراں کی قسم ہے
پھر معرکۂ خیبر و احزاب دکھا دے — خودداریٔ شمشیر نوازاں کی قسم ہے
پھر شمعِ تمدن سے ضیا بخش جہاں کو — افسانۂ تہذیب کے عنواں کی قسم ہے
پھر ہاتھ میں لے لے عَلَمِ حق و صداقت — اے مردِ عمل خونِ شہیداں کی قسم ہے
آ حرکتِ زیست میں پھر صورتِ غازی — احساسِ غمِ زود پشیماں کی قسم ہے
ھَل مِن کی صدا آج بھی دنیا کی فضا میں — سچ کہتا ہوں میں جذبۂ ایماں کی قسم ہے
آ نامِ علیؓ لے کے سرِ عرصۂ عالم — صد ولولہ و جوشِ فراواں کی قسم ہے
ہمصورتِ بوئے گلِ تر عطر فشاں ہو — احساسِ محبت کے گلستاں کی قسم ہے
اے ذوقِ طرب سازِ تجسس کو صدا دے — تجھکو غمِ جاناں غمِ دوراں کی قسم ہے
سُن نغمۂ بیداریٔ تقدیر بصد شوق — افلاس کے افکارِ پریشاں کی قسم ہے
تحریصِ یزیدِ لعین آج بھی انساں کیلئے ننگ — شبیرؓ کے ایثار کے داماں کی قسم ہے

ہر زمزمۂ عیشِ خود آرام فنا کیش
عبرت کدۂ چشم و دل و جاں کی قسم ہے

دنیا پہ عیاں کر دے ریاکاریٔ تلبیس
انسان تجھے عظمتِ انساں کی قسم ہے

ہاں چاک کر اغراض کا دامانِ سیاست
اے دستِ جنوں وحشتِ زنداں کی قسم ہے

تخلیق نئے راستے خود اپنے لئے کر
مختار کو مجبوریٔ ساماں کی قسم ہے

ہر ذرّۂ خاک آئینۂ حسنِ مصفّا
بتخانۂ ہر دیدۂ حیراں کی قسم ہے

حسن آئے سرِ طور بہ اندازِ قیامت
اے چشمِ کرم جنبشِ پیکاں کی قسم ہے

ہر چیز فدا عارضِ گلگوں کی چمک پر
اے حسنِ تصوّر تجھے قرآں کی قسم ہے

پھر بھر دے حرارت رگِ ایمانِ بشر میں
اے نطق شرر رمز سخنداں کی قسم ہے

مئی ۱۹۵۵ء

محاربۂ اسرائیل و عرب

اے سرزمینِ سیریا[1] اے مقتلِ تہذیبِ نو
پھوٹی ہے فلسطین[2] سے صبحِ ستمگاری کی بو

پھر بھُن رہی ہیں آگ میں انسانیت کی بوٹیاں
پھر سج رہی ہے اسلحہ سازوں کی دولت کش دکاں

پھر سود خوار، اربابِ زر یعنی یہودی سر بسر
کرتے ہیں ظلم مستتر بارِ دگر، بارِ دگر

پھر مصر کے بازار میں بکتا ہے حسنِ یوسفی
ایسا نہ ہو، ہونے لگے ناموس کی سوداگری

صحرائے سینا[3] میں ہے پھر اک روشنی گردش بپا
لیکن یہ نورِ حق نہیں یہ نار ہے آتش فزا

موسائیوں[4] کے ہاتھ سے توہینِ ارضِ طور ہے
غیظِ خداوندی! بتا؟ کیوں؟ ان سے اب تک دور ہے

جون ۱۹۶۷ء

۱؎ ملک شام ۲؎ فلسطین ۳؎ ریگستانِ سینائی ۴؎ یہودی

نغمۂ جمہور

سُنا ہے میں نے غریبوں کے جھونپڑوں میں تمام
صفیں چراغوں کی کرتی ہیں خیر مقدمِ شام

سُنا ہے میں نے کہ دریا اسنے لہلہا اُٹھے
بہار گذری ہے اس سمت سے بجشنِ تمام

سُنا ہے میں نے کہ رعنائیوں کی دوشیزہ
نقاب اُلٹنے کا اعلان کر رہی ہے عام

سُنا ہے غنچوں کو فطرت نے دی ہے دعوتِ رنگ
گلوں کو خندۂ جاوید کا ملا ہے پیام

سُنا ہے کیف کے کم ہونے پر ہے پابندی
زہے کہ مستیٔ و رندی نہ ہو سکے گی حرام

سُنا ہے سبز پری رقص پر ہے آمادہ
ہے آج گلشن عشرت میں آمدِ گلفام

سُنا ہے کام لیا اس نے اسمِ اعظم سے
بنایا جس نے یہ نقشِ سرور و کیفِ دوام

سُنا ہے بزمِ تمنا سجائی جائے گی
ادیب و شاعر و فنکار پائیں گے انعام

اگر یہ سچ ہے تو عیدِ سخنوری آئی
سمجھ لو ہند میں چھبیس جنوری آئی

۱۹۶۷ء

تنہائی[1]

یاد ہے مجھکو تری خلوتِ خود آمادہ
کم کم آزردگی اخلاص کی بارش زیادہ

وہ تیرے موکبِ جذبات کا شاہانہ جلوس
اور وہ میری تمنا کا سفر پیادہ

۱۹۶۷ء

[1] سنہ ۱۹۶۶ء کی ایک دلنواز شام کی سسکتی ہوئی یاد کے نام۔

قبائے حاکم

آدمی رسم و روایات کا پابند بنے
مجھکو منظور ہے تہذیب کا فرزند بنے

کرلے حاصل وہ بصد شوق علوم اور فنون
اپنے امکان کی سرحد میں ہنرمند بنے

خواہ قرآن کا قاری ہو کہ انجیل بدست
وید باچک ہو کہ وہ عاشقِ پا ژند بنے

ہو منافق بہ عمل مصلحتِ وقت کے ساتھ
ہو کے مغموم بظاہر کوئی خورسند بنے

خواہ فیشن کے تقاضوں کی پرستش کیلئے
منکرِ خالق کونین وہ ہر چند بنے

سب گوارا ہے مگر یہ نہیں منظور کہ وہ
ظلم حاکم کی قبا کا کوئی پیوند بنے

مئی ۱۹۶۸ء

رُخِ جمیل

ترے رُخِ جمیل کا جمال مسکرا اُٹھا
خطوطِ جسم ہنس پڑے تو خال مسکرا اٹھا

تصوّرات کی جبینِ پاک جگمگا اُٹھی
حدودِ عقل و ہوش میں خیال مسکرا اُٹھا

مئی ۱۹۵۴ء

آئینہ جو ٹوٹ گیا

خود فراموش بنایا مری بیتابی نے
دامنِ صبر و سکوں ہاتھ سے یوں چھوٹ گیا

دل جو ٹوٹا تو کئی بار یہ آواز آئی
آئینہ ٹوٹ گیا ٹوٹ گیا ٹوٹ گیا

مئی ۱۹۵۸ء

ادبارِ قوم

رفتہ رفتہ گر رہا ہے ہم نشیں معیارِ قوم
سرد پڑتا جا رہا ہے الغرض بازارِ قوم

خود غرض افراد کے ہاتھوں تباہی آ گئی
بن چکے مخدومِ ملّت جو تھے خدمتگارِ قوم

اب بظاہر کوئی اُمّید ترقّی ہے عبث
قوم پر چھایا ہوا ہے مستقل ادبارِ قوم

ٹوٹتے جاتے ہیں ایمان و عقائد کے محل
پتھروں سے دل کو بہلاتے ہیں اب معمارِ قوم

دعویٔ چارہ گری ہر شخص کرتا ہے مگر
قوم خود بیمار ہے افراد ہیں بیمارِ قوم

یا الٰہی آ گیا کیسا یہ دورِ انقلاب
کتنے بے غیرت ہوئے جاتے ہیں غیرت دارِ قوم

سر پہ ہر مفسد کے رکھی ہے کلاہ اصلاح کی
ہم سمجھ بیٹھے ہیں بدکرداروں کو اخیارِ قوم

اجنبی سا ہے مسلمانوں میں دینِ مصطفٰےؐ
سخت اُلجھن ہے کہوں کس سے میں حالِ زارِ قوم

المدد اے فاتحِ خیبر نبیؐ کے جاں نثار
دیکھ مٹتے جا رہے ہیں شاندار آثارِ قوم

۱۹۶۰ء

برہمنی

مسافروں کے مقدر میں رہزنی کب تک؟
رہے گی رہبرو! باہم تناتنی کب تک؟

جوان نسل کو تشویش اسکی ہے آخر
کنشتِ رسم میں ہوگی برہمنی کب تک؟

۱۹۶۲ء

جوازِ گریہ

ناواقفِ اسرارِ شہادت وہ بشر ہے
اسلامِ حقیقی پہ نہیں جسکی نظر ہے

قربانیِ نفسِ بشری تا حدِ ایثار
معراجِ اطاعت پہ بہ الفاظ دگر ہے

ہو سکتا نہیں قوت و کثرت سے ہراساں
وہ مردِ مجاہد جسے اللہ کا ڈر ہے

مرتا ہے تمنّائے شہادت میں جو مومن
وہ زندۂ جاوید بفتوئِ خبر ہے

روتے ہیں شہیدوں پہ فقط مومنِ کامل
اسلام سے یہ اُنکی محبّت کا اثر ہے

حمزہؓ کا عزاخانہ بہ ایمائے پیمبرؐ
تاریخ بتاتی ہے کہ اصحاب کا گھر ہے

حمزہؓ کی شہادت پہ نبیؐ روئے ہیں خود بھی
اے دشمنِ گریہ تجھے کچھ اسکی خبر ہے

ان اشکوں سے باطل کے جگر کانپ رہے ہیں
ہر قطرۂ اشکِ غمِ شہ تیر و تبر ہے

خوشنودیِ رب ہے غمِ شبیرؑ میں رونا
دلبندِ نبیؐ فاطمہؑ زہرا کا پسر ہے

۱۹۵۵ء

سعدی از دستِ خویشتن فریاد

خام کاروں نے کی وہ رسم ایجاد
خانۂ فکر و فن ہوا برباد

گھر میں گھر والوں نے لگائی آگ
"سعدی از دستِ خویشتن فریاد"

۱۹۶۳ء

یادگارِ انیس

دل کے احساس کی ہمراز زبانِ اُردو
آشنائے نگہہ ناز زبانِ اُردو

نغمۂ شوق کا ہے ساز زبانِ اُردو
کُل زبانوں میں ہے ممتاز زبانِ اُردو

خطّۂ ہند کی یہ اصل میں شہزادی ہے
طبع رنگیں ہے مگر وضع میں یہ سادی ہے

ضاحک و میر حسن مستحسن یعنی خلیق
ایسے ایسے شعرا بانوئے اُردو کے رفیق

مالک ملک سخن صاحب فنِ تخلیق
جن کے ہاتھوں میں ہے مفتاحِ دربیتِ عتیق

حرمِ شعر انھیں شمعوں سے ہے روشن ابتک
خالقِ فصلِ بہاراں ہے یہ گلشن ابتک

سب کو معلوم ہے وہ میر حسن جدِّ انیس
جس کا مشہور لقب سحر بیاں فن میں نفیس

جس نے کی سلطنت شعر و سخن کی تاسیس
میر صاحب کو کہیں کیوں نہ رئیس ابن رئیس

ملکِ اُردو میں حکومت کی بقا شاہد ہے
خاندانی یہ زباںداں ہے خدا شاہد ہے

اس گھرانے کی ہر اک فرد ہے ممتازِ سخن واقفِ سرِّ سخن ہمدم و دمسازِ سخن
رات دن گونجتی تھی گھر میں جو آوازِ سخن میر صاحب کا نرالا ہی تھا اندازِ سخن

سفرۂ شعر پہ رکھتے تھے بلاغت کا نمک
روزمرّہ تھا کہ تھا خوانِ فصاحت کا نمک

بیت ہے مخزنِ اسرارِ زبانِ جانِ بیاں مصرعہ آئینۂ تصویرِ جمالِ خوباں
لفظیں مانندِ عروسِ عجمی خوب و جواں حرف ترشے ہوئے ہیرے کی طرح ضو افشاں

مد اگر ابروئے دلدار کا آئینہ ہے
نقطہ بھی خالِ رُخِ یار کا آئینہ ہے

نظم کا ایسا سلیقہ کہ نہیں جسکی مثال وہ روایات کی صحت کا صحت مند خیال
علم پہ حرف کوئی لائے بھلا کس کی مجال فنِّ تاریخ و روایات و سیر میں وہ کمال

اصلیت جامۂ شعری میں کھری نکلی ہے
زن آئینہ جبیں بن کے پری نکلی ہے

وہ محاکات وہ عکاسی منظر وہ سماں پیچھے پیچھے ہیں خیالات تو آگے ہے زباں
دیکھو آئینۂ الفاظ میں تصویرِ بیاں صاحبِ علم و ہنر میر کے ہیں مرتبہ داں

ہم نے دیکھی نہیں الفاظ پہ قدرت ایسی
لذّتِ گوش ہے آوازِ فصاحت ایسی

مثنوی، قطعہ، غزل سب سے ہے شانِ اُردو — اس سے واقف ہیں جو ہیں مرتبہ دانِ اُردو
ختم ہے مرثیہ پہ حقِ بیانِ اُردو — اور اصناف ہیں قالب یہ ہے جانِ اُردو
حسنِ موضوع انیسِ سخن آرا کی قسم
جنتِ اہلِ نظر ہے دلِ بینا کی قسم

چہرہ ایسا جیسے تمہیدِ محبت کہئے — شاہدِ شعر و سخن جانِ فصاحت کہئے
رزم ایسی جیسے تلخیصِ شجاعت کہئے — بزم ایسی کہ زباندانوں کی صحبت کہئے
تیغ کی مدح میں گر اشہبِ خامہ چل جائے
جو سوار آئے حریفانہ وہ پیدل جائے

رزم وہ سن کے جسے جوشِ وغا پیدا ہو — لفظوں سے طبل و جلاجل کی صدا پیدا ہو
دل میں لڑنے کی تمنا بخدا پیدا ہو — حق پہ مر مٹنے کا اندازِ ولا پیدا ہو
کشتیٔ فکرِ مجاہد لبِ ساحل پہونچے
شورِ میدانِ وغا تا حدِ محفل پہونچے

گھر کا گھر آلِ محمد کا ثنا خواں ٹھہرا — عبدِ فرمان بہ خالقِ سبحاں ٹھہرا
عاشقِ احمدِ مختار بہر آں ٹھہرا — دیدۂ شرع میں یہ صاحبِ ایماں ٹھہرا
دہر میں تھا نہ کبھی اور کسی سے مطلب
تھا تو بس ذکرِ حسینؑ ابنِ علیؑ سے مطلب

مسلک عشقِ حسینؑ ابن علیؑ میں مشہور ۔۔۔ یہ گھرانا ہے یہ افضالِ خداوندِ غفور
صاحب غیرت و خوددار خوش اخلاق و غیور ۔۔۔ قابلِ ذکر ہے فرمانِ انیسؔ مغفور

"عمر گذری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں"
"پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مدّاحی میں"

فی الحقیقت نہ سمجھ پایا کوئی کیا ہے انیسؔ ۔۔۔ علم دانوں کے لئے فن کا معمّا ہے انیسؔ
رہِ ہستی سے عجب شان سے گذرا ہے انیسؔ ۔۔۔ سو برس بیتنے کے بعد بھی زندہ ہے انیسؔ

کرتے ہیں یاد اُسے ہم یوں بجائے اُردو
یادگار اسکی ہے تحریکِ بقائے اُردو

ہے یہ دنیائے ادب پر کرمِ ربِّ ودود ۔۔۔ قائم اس دور میں ہے بزمِ انیسِ ذی جود
بہرِ اُردو ہے حقیقت میں یہ فالِ مسعودؔ[1] ۔۔۔ علم و فن کا ہے ثمر دہر میں یوں نام و نمود

کربلا والوں کے صدقے میں بلندی پائے
اُردو اس دور میں معراج ترقّی پائے

۱۹۷۱ء

قطعہ

حلقۂ عشق میں کونین کی ہر شے ہے اسیر ۔۔۔ عشق کر لیتا ہے مرضیٔ خدا کی تسخیر
عشق کے یوں تو مدارج ہیں بہت سے لیکن ۔۔۔ عشق کی منزلِ آخر ہے مقامِ شبیرؑ

۱۹۵۷ء

[1] پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے تعمیل ارشاد میں یادگار انیس کمیٹی کے لئے یہ نظم لکھی گئی

انجمن وظیفۂ سادات مومنین

افلاس و بے زری کی نحوست مٹائیے — بڑھئے حضور آگے ذرا ساتھ آئیے
اس انجمن وظیفۂ سادات کے لئے — کچھ کیجئے درستیٔ حالات کے لئے

نکتہ یہ انقلاب کے ہے شورِ الاماں — برپا ہے شہرِ قوم میں ہنگامۂ فغاں
تعلیم و تربیت کا سہارا کوئی نہیں — اس دورِ مفلسی میں ہمارا کوئی نہیں
ملّت کا حالِ زار سُنایا نہ جائے گا — گر سنئے گا تو ہوش میں آیا نہ جائیگا
ہر تیسرا البشر جو ہے بے روزگار ہے — خود اپنے گھر میں رہ کے غریب الدیار ہے
ہے انجمن وظیفۂ سادات و مومنین — خواہانِ علم و فن کی مددگار اور معین
ملّت کے گھر میں اس کی بدولت ہما ہمی — اس کی مدد ہے قوم کی امدادِ باہمی

پیشِ نبیؐ و آلِ نبیؐ سرخرو بنو
تم بھی اس انجمن کی رگوں کا لہو بنو

۱۹۷۸ء

دُعا

خدا سے گڑگڑا کر دردمند و — وہ لَے وہ لہجہ وہ آواز مانگو
جو پتھر کے جگر کو خون کر دے — جو چرخِ پیر کو مطعون کر دے
جو خود تقدیر ساز اسباب جو ہو — بروزِ آخرت جو سرخرو ہو

جو بندے کو خدا آگاہ کر دے　　سر فرازِ سر و درِ جاہ کر دے
دعا کو ہاتھ اُٹھیں جب ہُلک[1] سے
صدا آمین کی آئے فلک سے

۱۹۶۷ء

حسنِ معنیٰ

مری نوا پہ لہا لوٹ گیت کا آہنگ　　مری غزل میں ترنم کا حسن ہے پنہاں
مرا سکوتِ تکلّم کا حسنِ معنیٰ خیز　　مرا بیان محبت کے درد کا درماں
وہ میری شامِ الم صبحِ عیش کا پرتو　　کہ جس کے جامِ تبسّم میں اشک کا طوفاں
میں دیکھتا ہوں نگاہوں سے اپنی جو منظر　　نگاہِ اہلِ خرد سے وہ آج تک ہے نہاں
یہ میرا ظرفِ نظر ہے کہ میں نہیں بیہوش
نہیں میں اُمتیِ شوقِ موسیٰؑ عمراں
نظر کی بھیک میں دیتا ہوں حسن والوں کو　　کہ حسن میری نظر کو خراج دیتا ہے
مگر یہ کیا ہے کہ پہلو نشین دل میرا　　فریب مجھکو برنگِ زجاج دیتا ہے
یہ لوٹتا ہے کسی بزمِ ناز میں جب بھی
تو مجھکو حوصلۂ احتجاج دیتا ہے

۱۹۶۱ء

---

[1] انتہائی اخلاص بزبانِ ہندی۔

حقیقتِ حُسن

لہو کی گردشِ پیہم رگوں کی شادابی　　کسی کے چہرۂ انور کی دیدہ تو شادابی

یہ رنگ روپ یہ جادو نگاہیاں توبہ!　　یہ حُسن مُصحفِ رُخسارِ پانزدہ سالی

گٹھا گٹھا سا بدن انگ انگ کا یہ تناؤ!　　دلوں کو کھینچنے والا نظامِ اعصابی

کھنچے کھنچے سے خد و خال مثلِ مقناطیس　　ملیح جسم کا دلکش یہ رنگِ عنابی

لبوں سے بارشِ صہبائے زندگی پیہم　　یہ پھوٹتی ہوئی چشمِ سیہ کی مہتابی

دہن وہ تنگ کہ غنچے کا دل بھی بول اُٹھے　　ملی نہ قفلِ دلآویز کی کہیں چابی

انڈیلتا ہے حیا کا پسینہ روز و شب　　جوانِ کشتِ تمنا کا ذوقِ سیرابی

وہ اک نگاہ کی گردش روانیٔ شمشیر　　محیطِ لذتِ غم میں دلوں کی غرقابی

صدائے بربطِ و چنگ و ربابِ احساسات　　سمیٹتی ہے مسامات کی تُنک تابی

سوال بن کے کھڑے ہیں حضور میں جس کے　　یہ برکلے - یہ ارسطو - یہ ژاں - یہ فارابی

ق

یہ میرؔ ہیں یہ ہیں آتشؔ یہ غالبؔ و اقبالؔ　　ہے جنکو زیرِ لحد شکوۂ گراں خوابی

میں کیا کروں کہ ہے اب تک جو مبحثِ شکوہ　　جمال آباد میں جنسِ وفا کی کمیابی

لہو نہ جسم میں ہو گر تو چہرہ بے رونق　　اسی سے حُسن میں ہے نور و رنگ شادابی

جو چوس لیتا ہے خونِ رگِ غزالِ تناں　　ہے ساہوکار[1] - یہوؔدی - مغلیہؔ - پنجابیؔ

سمجھ سکی نہ کبھی حُسن کی حقیقت کو　　غرورِ دولتِ بد ذوق کی گراں خوابی

[1] سود خوار طبقے جو انگریزی عملداری میں ہندوستانیوں کو تنگ کرتے تھے اور اب بھی اُن کے ہم مشرب ایسا کرتے ہیں۔

صدائے دل[1]

نام سے خالقِ اکبر کے ہے آغازِ کلام ‌ ‌ ‌ لائق حمد و ستائش ہے جو ہر صبح و شام
بھیجیں سب لوگ محمدؐ پہ درود اور سلام ‌ ‌ ‌ آل سے جنکی زمانے میں ہے زندہ اسلام

ہو گی جب منقبتِ آلِ عبا کی تفسیر
صاف ہو جائے گی لولاک لما کی تفسیر

ہم غلامانِ غلامانِ رسولِ مختار ‌ ‌ ‌ بصد اخلاص ہیں جب خواجۂ قنبر پہ نثار
خدمتِ خلق کا ہو کیسے نہ جذبہ بیدار ‌ ‌ ‌ یہی صدیوں سے بتاتا ہے ہمارا کردار

گھر لٹا سکتے ہیں ہم نامِ شہِ والا پر
جان دے سکتے ہیں پیغامِ شہِ والا پر

دامنِ کوہ ہمالہ میں ہے ہلور آباد ‌ ‌ ‌ رہتی اس جا ہے رسولِ عربی کی اولاد
خواجہ تاشِ علوی پاک دل و نیک نہاد ‌ ‌ ‌ مرحبا جذبۂ قومِ اہلِ وطن زندہ باد

حبذا ملت جعفر تری شیدائی ہے
قوم اس مرکزِ واحد پہ سمٹ آئی ہے

[1] آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس چہل و ہفتم سنہ ۱۹۷۳ء بمقام ہلور پڑھی گئی۔

یہ زمیں قصبۂ ہلور کی پُر نور زمیں — حسنِ فطرت کے تقاضوں سے ہے بھرپور زمیں
جلوۂ حق سے بہر طور ہے معمور زمیں — اہلِ بینش کیلئے آئینۂ طور زمیں
دامنِ آلِ عبا سایہ فگن ہے اس پر
ناز فرمائے جہاں میرا وطن ہے اس پر

علم و عرفان و شریعت کا چمن ہے مشہد — کہتے ہیں مشکِ مودّت کا ختن ہے مشہد
گوہرِ تاجِ امامت کا عدن ہے مشہد — کتنے اربابِ سیادت کا وطن ہے مشہد
ہدفِ ظلم ہمارے بھی جو اجداد ہوئے
طوس کو چھوڑ کے ہلور میں آباد ہوئے

شاہِ دیں شاہِ خراسان رضاؑ کا مرقد — چھُٹ گیا ہم سے غریب الغربا کا مرقد
منبعِ جود معین الضعفا کا مرقد — فخرِ کونین - انیس الفقرا کا مرقد
اہلِ دیں جسکی زیارت کے لئے جاتے ہیں
اور سکانِ فلک بہرِ طواف آتے ہیں

سر سے اونچا ہوا پانی ستمِ بے حد سے — تن بہ تقدیر مگر عزم و عمل کی کد سے
کارواں اہلِ مودّت کا چلا مشہد سے — ہند جنّت بنا اس قافلہ کی آمد سے
سوئے دریا نہ رُخ موڑا امارت کیلئے
آیا ترہٹ[1] کی طرف نشرِ شریعت کیلئے

[1] پوربی اضلاع کا قدیم نام ترہٹ ہے۔

تھا جو اللہ کو منظور کہ ظاہر ہو شرف　　بہ طفیلِ کرم و جودِ شہنشاہِ نجف

دیکھ کر حسن کراماتِ بزرگانِ سلف　　نظر دیدہ اورنگ مڑی انکی طرف

شاہ[1] دہلی نے زمیں رہنے کو کافی دیدی

اور جو راسی مواضع کی معافی دیدی

جبکہ حضرت محل آمادۂ ہجرت ہو کر　　معہٗ شہزادۂ برجیس بہ ایمائے سفر

سوئے نیپال روانہ ہوئی تھیں بے لشکر　　ٹھہریں ہلوّر میں آکر بصد اجلال و فر

اسی ہلوّر سے ان کو بھی مددگار ملے

گئے نیپال تک اس طرح کے غمخوار ملے

آؤ اور قصبۂ ہلوّر میں آکر دیکھو　　تذکرہ آل پیمبرؐ کا ہے گھر گھر دیکھو

یہ عزاخانۂ فرزند پیمبرؐ دیکھو　　شوق سے مسجد و درگاہ کا منظر دیکھو

ان مزارات مطہّر کی زبانی سن لو

میرا[2] بابا کے تقدس کی کہانی سن لو

میرا بابا کہ جو تھے باغ سیادت کے پھول　　عاشقِ آلؑ عزادارِ جگر بند بتولؑ

بندۂ خاص علیؑ کہئے جنھیں عبدِ رسولؐ　　بارگاہِ احدیت کے غلامِ مقبول

عارفِ ذات خدا مظہرِ ایمانی تھے

ایک عالم کے لئے مرکزِ روحانی تھے

[1] بادشاہ عالمگیر ثانی بسلسلہ شکار و شرف زیارت شاہ عبد الرسول ہلوّر تشریف لائے اور مواضعات کا فرمان عنایت کیا۔
[2]۔ شاہ سید عبد الرسول علیہ الرحمہ جنکا مزار ہلوّر میں مرجعِ خلائق ہے۔

نیرّ برج شرافت پسر شیر خدا — عام لوگوں میں جو مشہور تھے میرابابا
اس علاقہ میں جو تھے داعیِ ایماں تنہا — بانیٔ رسم عزاداریٔ شاہِ شہدا
مائل دیں بھی ہوئے صاحب ایماں بھی ہوئے
ان کے ہاتھوں پہ کئی لاکھ مسلماں بھی ہوئے

عالم و عابد و زاہد تھے وہ پاکیزہ صفات — خدمت دیں میں لگے رہتے تھے ہردم دن رات
میر آبابا نے بسر کی تھی بتجرّد میں حیات — انکے بھائی کی ہیں اولاد یہ رضوی سادات
میر آباباؒ کے تھے دو بھائی خلیلؒ و مسلمؒ
ابن عم تیسرے بھائی تھے جناب ہاشمؒ

رضوی المشہدی ہاشمؒ و خلیلؒ و مسلمؒ — کفر کے دیس میں سر کر گئے ایماں کی مہم
مسندِ فقر و قناعت پہ دلوں کے حاکم — سالکِ راہ رضا عابد و زاہد عالم
اپنی اولاد کو میراث مودّت دیدی
پائی اجداد سے جو دین کی دولت دیدی

سیّد پاک نجیب الطرفین اہل اللہ — واقفِ منصب آل نبویؐ حق آگاہ
حرصِ دنیا سے بری دین کی رکھتے تھے چاہ — یوسفِ مصر ولائے علوی عالیجاہ
دن گذرتا تھا جو سرور کی عزاداری میں
رات کٹتی تھی سدا تذکرۂ باری میں

ماتمی انجمنیں دو ہیں یہاں مستحکم یعنی گلدستۂ ماتم و فروغِ ماتم
جو مناتی ہیں بہ ہر سال شہِ دیں کا غم ایک کا کالا علم ایک کا ہے سبز علم

یادگارِ انجمن[1] اک نام حسینیؑ کی ہے
ذمہ دار اب بھی جو پیغام حسینیؑ کی ہے

بہ طفیل و کرمِ بازوئے سرورؑ عباسؑ آج ہلورؔ میں ہے کانفرنس کا اجلاس
بزم میں باغ تشیعؔ کے گلوں کی ہے باس قومی اجلاس کی یہ نظم بنی ہے عکاسؔ

بانیٔ کانفرنس آقا حسنؔ کے شیدا
اہلِ ہلورؔ ہیں ایماں کے یہ چمن کے شیدا

فیصلہ قوم کی تقدیر کا کرنا ہوگا قوم کو قعرِ مذلت سے ابھرنا ہوگا
از سرِ نو پھر انداز سنورنا ہوگا زندگی کے لئے پھر قوم کو مرنا ہوگا

ظلم آمادہ ہیں پھر کہنہ روایت کے یزیدؔ لعین
ابھرے پھر شکوۂ کوتاہیٔ قسمت کے یزیدؔ لعین

اپنے اجداد کی عظمت پہ غرور بیجا دیکھ اے قوم کہ حالت تری یہ ہوگئی کیا
مرثیہ خوانِ تباہی نہ بن اب ہوش میں آ عرصۂ زیست میں کردار و عمل کو اپنا

زندہ رہنا ہے تو فرسودہ روایات کو چھوڑ
خواب آور جو ہیں ان پست حکایات کو چھوڑ

[1] انجمن یادگارِ حسینی ہلورؔ

ہمت افزا ہے بہت نام حسینؑ ابن علیؑ — ہوش میں لاتا ہے اک جام حسینؑ ابن علیؑ

صرف کردار ہے پیغام حسینؑ ابن علیؑ — قوم کیا ہے؟ فقط انعام حسینؑ ابن علیؑ

گھر جو لٹوایا تو اک قوم کا کتبہ بخشا

شہ کو اللہ نے کوثر کا قبالہ بخشا

کشتئ ملت جعفریہ پہ بُرا وقت ہے آج — بدلا بدلا سا ہے کچھ بحر حوادث کا مزاج

اہل کشتی پہ عجب بے عملی کا ہے راج — صرف اوراد کی ہے رسم وظائف کا رواج

کوئی پتوار کا حامل نہیں بڑھتا آگے

اور طوفان چلا آتا ہے چڑھتا آگے

لے کے پھر حیدرؑ کرار کا نام آگے بڑھو — جو ملا شہ سے وہی لیکے پیام آگے بڑھو

زندگی میں تمہیں کچھ کرنا ہے کام آگے بڑھو — عملِ خیر کی پھر لے کے حسام آگے بڑھو

قلعۂ خیبر آفات کو غارت کر دو

مرکزِ جملہ فسادات کو غارت کر دو

چاہیئے ملت بیضا کی ہو تعمیر نئی — اتحادِ عمل و فکر کی تدبیر نئی

منبر وعظ پہ ہو کام کی تقریر نئی — فیضِ آل نبویؐ سے بنے تقدیر نئی

قوم میں روح نئی پھونکنے والو جاگو

وقت ہے برسر جنگ اب سے جیالو جاگو

۱۹۶۳ء

ردِّ عمل

احمقوں کے نئے شہر میں

حسن کی کتنی گلپوش آبادیوں کو مٹانے کی خواہش لئے

تیشہ زن اُٹھے

تیشوں کی نوخیز بُرّشِ لئے

ڈھا رہے ہیں در و بام و محراب و سقف

یہ در و بام جن کے کہن سال سایوں کی ٹھنڈک میں تھا

گرمیٔ عشق کا دیوتا

آج اُن زلف پرور مقامات سے

اُٹھ رہا ہے لہو کا دھواں

وہ لہو جس میں معصوم جذبات کی لاش ہے

عالمِ خوابِ فردا پہ گلپاشں ہے

بھُن رہا ہے لطافت کا حُسنِ سُبک

آتش فن کی بھٹّی میں موجود ہے

زندگی کے تصوّر کا

مذہب نیا

جس کو ایجاد بندہ کہیں

احمقوں کے نئے شہر میں

ایک واعظ کی ریشِ گنہ پوش کی آڑ میں

جرمِ اخلاق کے ایک منشور پر

خون سے صاحبانِ ہوس نے بصد شوق یوں دستخط کر دیئے

جیسے کُل کائنات ان کی ہی مِلک میں آگئی

احمقوں کے نئے شہر میں

اہتمامات جشنِ مسرّت

ہر سو نظر آرہے ہیں

احمقوں کا نیا شہر ہے

ایک دلچسپ

تفریح گاہِ جنوں

غالباً

ان کے اجداد کی

پست نسلی

کا ردّ عمل

ہے یہی

۱۹۶۶ء

آؤٹ سائڈر[1]

تثلیثِ شہود

مشہود - درون - برون

تن کی دنیا من کی دنیا باہر والا تول رہا ہے
رازِ درونِ دل کا پردہ لحظہ لحظہ کھول رہا ہے

باہر والا بول رہا ہے، باہر والا بول رہا ہے

صحتِ سوزِ بدن کی خاطر شربتِ فکر و فن کی خاطر
تند مضامیں آبِ دہن میں ساغر ساغر گھول رہا ہے

باہر والا بول رہا ہے باہر والا بول رہا ہے

کس نے پھر آواز لگائی پھر کس کی ہوگی رسوائی
جنسِ گرانِ شخصیت کو اَو نے پَونے تول رہا ہے

باہر والا بول رہا ہے باہر والا بول رہا ہے

لفظوں کا بازار لگا ہے اس میں گروہِ شوق گھسا ہے
پتھر، یا تو، شیشہ، چاندی، ہیرا، سونا مول رہا ہے

باہر والا بول رہا ہے باہر والا بول رہا ہے

کربِ زمانی کے در ٹوٹے سحر مکانی کے گھر ٹوٹے
وقت کے دھاگے میں فطرت کے لاکھوں موتی رول رہا ہے

باہر والا بول رہا ہے باہر والا بول رہا ہے

ذات و صفت میں یہ مہجوری طاقت کی اتنی مجبوری
من کے حاکم مستِ قضا ہیں راج سنگھاسن ڈول رہا ہے

باہر والا بول رہا ہے باہر والا بول رہا ہے

[1] بیگانۂ شہود ہم شش کس طرح رہوں ÷ باطن کی بات چھوڑئیے ظاہر کو کیا کروں

چاکِ قبائے ہوش و خرد کو جامۂ اسرارِ مقصد کو   دستِ جنوں نے خاک سیا ہے دامن دامن جھول رہا ہے
باہر والا بول رہا ہے باہر والا بول رہا ہے
جب سے زمیں بیدار ہوئی ہے جب سے فلک نے آنکھیں کھولیں   یہ باتیں دونوں نے دیکھیں زینتِ کفِ کشکول رہا ہے
باہر والا بول رہا ہے باہر والا بول رہا ہے

۱۹۶۲ء

افراتفری

زندگی میں ہے وہی اگلی سی افراتفری   جو تقاضا تھا نہ پورا ہوا آزادی کا
اب گرانی کا یہ عالم ہے کہ جینا ہے محال   جانے کیا حال ہو بڑھتی ہوئی آبادی کا

۱۹۶۲ء

۸ نفر

ہر شخص میرے شہر میں اس کا گواہ ہے   رسموں سے تنگ نسلِ بشر خوامخواہ ہے
مہنگائی کا بُرا ہو کہ اس کے طفیل آج   اک خاندان آٹھ نفر کا تباہ ہے

۱۹۶۲ء

جنونِ عمل

اس وادیٔ ابہامِ محبت میں دلِ زار   دیکھا ہے یہی، اپنا حریف آپ رہا ہے
دیوانے کو فرصت نہیں تفریحِ چمن کی   یہ وسعتِ صحرا کو ابھی ناپ رہا ہے

۱۹۶۲ء

فلسفۂ زندگی

زندگی کا ہر بشر کے سامنے انجام ہے
زندگی بھی اک فریبِ خوشنما کا نام ہے

رات کا خونیں کفن، چاکِ گریبانِ سحر
دن کی میّت بھی رہینِ التفاتِ شام ہے

اصطلاحِ عام میں کہتے ہیں جسکو زندگی
ابنِ آدم پہ بہر صورت وہ اک الزام ہے

اک طلسمِ ممکناتی ہے وجودِ موت و زیست
رحمتِ حق ایک اک اللہ کا اکرام ہے

ہے یہ سورج وقت کی ہر تازہ تربت کا چراغ
چاند کیا؟ شمعِ مزارِ گردشِ ایام ہے

ترکِ اولیٰ کا ہے کفّارہ سرابِ زندگی
رنگ نا رِ آدمیت محبسِ اوہام ہے

ہر نفس ہے ماتمی گذرے ہوئے انفاس کا
اک عزاخانہ میانِ گردشِ ایام ہے

۱۹۵۶ء

بہبود

پارلمنٹ کے جھگڑوں سے بچا کر دامن
میں نے چاہا تھا کہ آئینِ جنوں عام کروں

اور یہ بھی جو نہ ممکن ہو تو تنہائی میں
فکرِ امروز کو غرقِ مئے گلفام کروں

پھر گئے لوگ مرے پیچھے صدا آنے لگی
یہ تو دیوانہ ہے دیوانے کو پتھر مارو

سُن کے یہ دل نے کہا بیٹھ کے دشتِ غم میں
نامِ بہبود پہ سو جوتے مکرّر مارو

۱۹۶۸ء

عورت

آدم کے لال مرکزِ الفت کہیں جسے
حوّا کی دلفریب امانت کہیں جسے

اک شاہکارِ صنعتِ خلاقِ کائنات
اک اعتبارِ حسنِ مشیّت کہیں جسے

یہ ہٹ کا بُت ہے ضد کا صنم عشق کا خدا
پتھر کا اک وجود کہ عورت کہیں جسے

یہ سنگ وہ ہے جسکی رگوں میں لہو بھی ہے
سرمایہ دارِ اشکِ محبّت کہیں جسے

اک آرزوئے جنّتِ لذّاتِ دنیوی
اک شاہدِ فریبِ حقیقت کہیں جسے

دنیائے دل میں سوزشِ احساس کی نمود
اک خوشنما شرارِ محبّت کہیں جسے

بربادیٔ حیات کا سامان دلپسند یہ
مجبورِ زندگی کی ضرورت کہیں جسے

آزادیوں کے واسطے زنجیرِ زرخرید
فتنہ بہ گام موجبِ آفت کہیں جسے

عورت ہے وجہِ کشمکشِ زندگی کہ ہے
دوزخ مگر نمونۂ جنّت کہیں جسے

یہ بھی ہے سچ کہ ہے یہ شریکِ غمِ حیات
لیکن یہ خود وہ غم ہے کہ راحت کہیں جسے

۱۹۵۶ء

قطعہ

کس دن ثمر اس عالمِ ایجاد کے اندر
سچ پوچھو کہ اربابِ غمِ دل نہیں روتے

احساس خودی کا ہے کہ یہ پاسِ وفا ہے
روتے ہیں مگر برسرِ محفل نہیں روتے

۱۹۵۶ء

ترقیٔ معکوس

وہ کام کر گیا مکرِ سیاستِ سالوس
کہ آج تک ہے تحیّر میں فکرِ جالینوس

غذا ممدِّ حیاتِ بشر نہیں ہے کہ آج
بدن کو چوس رہا ہے طعام کا کیموس

خوشی نہ دے سکی عشرتکدوں کی آبادی
ہے اب بھی فرقِ تفکّر پہ بارِ نامحسوس

متاعِ ہوش اڑا لے گیا قیامت ہے!
سرودِ لذّتِ چنگ و رباب و بربط و کوس

ہمارے دل میں ہے محنت کی جا پہ کسل مکیں
ہمارے ہاتھ میں تلوار کی جگہ طاؤس

زکاتِ علم و ہنر دے رہے ہیں سب کو مگر
ہمارے حق میں ہیں مغرب کے ذی ہنر کنجوس

ہمارے ذہن کے کمروں میں گھُپ اندھیرا ہے
بجھے بجھے سے ہیں فکر و خیال کے فانوس

زر و جواہر و لعل و گہر پہ متصرّف
زمانے بھر میں نظر آتے ہیں یہود و مجوس

ہم آگے بڑھ نہیں سکتے بہ اقتضائے عمل
بہت ہمارے لئے ہے ترقیٔ معکوس

۱۹۷۲ء

رُباعی

رُخسار و لب و قد کا چمن زندہ باد
نسرین و گل و سرو و سمن زندہ باد
کل ہم سے ثمرؔ کہتے تھے غم کے مارے
یہ بزمِ مئے شعر و سخن زندہ باد

۱۹۵۶ء

ما و تو

شہر کے خوش باش کچھ تھے جمع اک ہوٹل میں آج
تو تو میں میں کا ہوا آغاز کہہ کر میں کہ تو

ذمہ دار اس دورِ ناہنجار کا ٹھہرے گا کون
بھوک کی جنتا یا کہ نیتا چوستے ہیں جو لہو

"یہ بہن چو اور مادر چو ابھی تک ہیں حریص"
رہتی ہے بے فکروں کو کرسی کی خالی جستجو

بات بڑھتی ہی گئی مہنگائی کی مانند جب
کی شروع اک ٹیڈی نیتا نے وہاں یوں گفتگو

ہو کے خوش برساتی مینڈک کی طرح وہ بول اٹھا
حیف جنتا میں ہے اب تک امتیازِ ما و تو

بھکمری ۔ بے روزگاری ۔ انتشارِ افلاس[1]
ناز کرنا چاہیئے آزاد ہو کر کو بہ کو

ذکر فقر و فاقہ لب تک آنے سے کیا فائدہ
مفت میں لٹ جائے گی اہلِ وطن کی آبرو

رفعِ شر کے واسطے میں نے کہا "ہاں! کیوں نہیں"
دیش تو آزاد ہے لیکن بقیدِ آرزو

۲۸ نومبر ۱۹۶۸ء

قطعہ

چھیڑتے ہیں جان کر سب لوگ دیوانہ مجھے
آج کہنا ہی پڑے گا اپنا افسانہ مجھے

مجھ پہ وحشت کا نہ جانے کس لئے الزام ہے
کھینچتا ہے اپنی جانب خود سے ویرانہ مجھے

۱۹۶۶ء

---

[1] نقل قول بصد معذرت

ہمزاد[1]

اپنا سایہ بھی ہے یہ آدمی ہمزاد بھی ہے
نغمۂ شوق بھی ہے لذّتِ فریاد بھی ہے

یہی خالق بھی ہے تخئیل کے مستقبل کا
اور تخئیل کے ماضی کی یہ اولاد بھی ہے

عکس جو چاہے بنا دے اسے ہمدم ورنہ
یہی آئینہ بھی ہے اور یہی فولاد بھی ہے

جسم کے گھر سے بہر لحظہ نکلنے والا
انقلابات کے ہر موڑ کی روداد بھی ہے

ایک آئینۂ حیرت ہے کہ ذہنِ بشری
غم کے جھرمٹ میں تعجب ہے کہ دلشاد بھی ہے

ایک چہرے کے کئی رُخ سے ہیں لاکھوں چہرے
لاکھوں چہروں کا یہ اک نسخۂ ستم ایجاد بھی ہے

یہ نظر بندیٔ آرائشِ احساس، چہ خوب!
جو ہے بیداد کا شکوہ وہی بیداد بھی ہے

۱۹۶۴ء

قطعات

۱

شکریہ تیرا مجھے آنچل اوڑھانے والے
آج کی رات طبیعت مری گھبراتی ہے
نیند آتی نہیں کیا بات ہے یہ راز ہے کیا؟
تیرے آنچل سے مجھے بوئے کفن آتی ہے

۲

آنکھ سے آنسوؤں کی بھیک نہ مانگ
لے نہ احسان ان کے آنچل کا
غمِ الفت گذار دے دل پہ
خود ہی ہو جائے گا یہ غم ہلکا

۱۹۵۵ء

[1] ایک نفسیاتی اور ما بعد الطبیعاتی تجزیہ۔

یو۔ این۔ او (U.N.O)

امنِ عالم کے ٹھیکے دار اُٹھے ۔۔۔ لے کے الفاظ کے مزار اُٹھے
ذوقِ تقلید و سجدۂ تسکیں ۔۔۔ دل میں لیکر وہ خاکسار اُٹھے
زیر دستوں کو ہو نویدِ بقا ۔۔۔ سر پرستانِ ذی وقار اُٹھے
جنگ کی داغ بیل پڑ جائے ۔۔۔ فتنۂ رنجِ کارزار اُٹھے
امنِ عالم کا دل پسند سوال ۔۔۔ یو۔ این۔ او میں جو بار بار اُٹھے
اسلحوں کی ہو گرم بازاری ۔۔۔ دولتِ گنج قرضدار اُٹھے

لوگ سمجھیں کہ صلح جو ہم ہیں
آدمیت کی آبرو ہم ہیں

۱۹۶۰ء

قطعہ برنگ نو (مبیح جدید)

جیسے کیف و سرورِ حرفِ غزل ۔۔۔ جیسے کیفیتِ شرابِ کہن
جیسے صبحِ وطن کی پہلی کرن ۔۔۔ جیسے گھونگھٹ میں مسکرائے دولہن
اور جیسے کنوار کا بادل ۔۔۔ یوں خوشی مرے دل میں آتی ہے
دو گھڑی رہ کے مسکراتی ہے

۱۹۶۰ء

حدیثِ گیسو

کھُلی وہ زلفِ معنبر بدوشِ محبوبی
چلا وہ قافلۂ نکہتِ خوش اسلوبی

چمن میں بزم میں اور میکشوں کے جھرمٹ میں
بیان ہونے لگی شامِ وصل کی خوبی

کسی حسینہ کی زلفِ سیاہ کے آگے
سبک ہے دیدۂ آہوئے دشتِ مطلوبی

نظر فریب نہ کیوں زلفِ مشکفام بنے
کہ اس کا ہلکا سا پرتو ہے حسنِ تیروبی

ہمیشہ چھا کے رہے گی کسی کے گیسو کی
بہ بزمِ اہلِ محبت شمیمِ مندوبی

یہ وہ شمیم ہے جس سے طبیعتِ بشری
دیارِ شوق میں ہرگز، کبھی، نہیں اوبی

یہ تارِ زلف کی عشوہ طرازیاں توبہ!
کبھی دریچہ کبھی ہے ردائے محجوبی

یہ خشک طرزِ سخن اور یہ ایں ہمہ کاکل
ہے وجہ کشمکشِ اضطرابِ مرغوبی

ہزار رنگ بہ عشوہ ہے کاکلِ شب رنگ
ہر ایک تارِ نظر میں جُدا جُدا خوبی

نہ راس آئے گی عشقِ نیاز کیش تجھے
دیارِ حُسن کی آب و ہوائے مرطوبی

یہ نوبت آئی کہ چاہِ فراقِ گیسو میں
مری سیاہیٔ تقدیر مجھ کو لے ڈوبی

اسی کی یاد نے محویتوں کے کمرے میں
بُنا ہے بیٹھ کے سو بار دلقِ مجذوبی

اسی سے حسن کی رونق دوبالا ہوتی ہے
یہ مانا رنگ ہے زلفوں کا حُسنِ منسوبی

اُٹھا جو گھر میں سوالِ تجارتِ گیسو
لرز لرز گیا انجامِ صبرِ الیوبی

۲۷۔۴۔۱۰

ؔ بحرِ اعظم افریقہ کے ملک کینیا کا مشہور شہر جہاں کے لوگ کالے ہوتے ہیں۔

رشوت کے چار ہاتھ

گماں ہوتا ہے جیسے ہے نصیبِ آدمی رشوت
کسی نے دی کبھی رشوت کسی نے لی کبھی رشوت

حرام اربابِ میخانہ کی، جائز شیخ کی رشوت
کہیں پہ فضلِ ربّی ہے کہیں پہ حق یہی رشوت (۱)

زمانہ میں اسی رشوت سے لاکھوں کام بنتے ہیں
نہ جانے اس کے چلتے کتنے راون رام بنتے ہیں

مقدر یہ ہے جسکو جس طرح سے بھی بھلی رشوت
کہیں پہ فضلِ ربّی ہے کہیں پہ حق یہی رشوت (۲)

یہ نا اہلی کا پردہ ہے جہالت کا یہ پردہ ہے
کہ غاصب کے ضمیرِ مردہ طینت کا یہ پردہ ہے

زمانے بھر کے عیبوں کا یہی پردہ بنی رشوت
کہیں پہ فضلِ ربّی ہے کہیں پہ حق یہی رشوت (۳)

زمیں پہ بیٹھنے والوں کو مسند پہ بٹھاتی ہے
خدا جانے یہ ہر انسان کو کیوں راس آتی ہے

اُسے کرتی ہے پورا جو کبھی ہوتی ہے کمی رشوت
کہیں پہ فضلِ ربّی ہے کہیں پہ حق یہی رشوت (۴)

یہ ہر تخریب کے آگے ہے ہر تحریک کے پیچھے
ترقی جال بُنتی ہے اسی تکنیک کے پیچھے

وہ احمق ہے نہ اب تک جس نے دی ہو اور نہ لی رشوت
کہیں پہ فضلِ ربّی ہے کہیں پہ حق یہی رشوت (۵)

جہاں موقع ہو جیسا ویسی رشوت لوگ لیتے ہیں
بقیدِ مصلحت رشوت زمانہ ساز دیتے ہیں

رقم کی، مال کی، اجناس کی، یا بات کی رشوت
کہیں پہ فضلِ ربّی ہے کہیں پہ حق یہی رشوت (۶)

(۱۹۷۰ء)

اقتدار پسند

فلک سے آتی ہے ہر دم یہی صدائے سروش
خطیبِ غاصبِ منبر فقیہہ دین فروش

یہ اقتدار پسندِ زمانہ ہیں کہ جنھیں
نہ فکرِ ماتمِ امروز ہے نہ کچھ غمِ دوش

(۱۹۷۲)

استقبالِ عید

لذتِ حسنِ سحر رونقِ شب رخصت ہے　　　　ناز برداریٔ و مہمانیٔ رب رخصت ہے
قربِ معبود کی عزت کا سبب رخصت ہے　　　　سال کا ماہِ عبادات لقب رخصت ہے

قدرداں جس کے پیمبرؐ تھے وہ اب جاتا ہے
یعنی محبوبِ شہنشاہِ عرب جاتا ہے

الوداع اے رمضاں ماہِ پسندیدۂ حق　　　　تیری آمد تھی کہ رحمت کا پیامِ مطلق
اہلِ ایماں کو ترے جانے کا ہے سخت قلق　　　　دیکھ لے خود کہ مسلمانوں کے چہرے ہیں فق

عبد و معبود کی قربت کے بہانے رخصت
حسنِ معراجِ مسلماں کے زمانے رخصت

بن کے افسانۂ تقدیر کی تمہید آئی　　　　للہ الحمد کہ بعدِ رمضاں عید آئی
بندگی لیکے نئی زیست کی امید آئی　　　　کرکے معبود سے اک عہد کی تجدید آئی

پھر جئیں گے تو بہارِ رمضاں دیکھیں گے
جذبۂ شوقِ عبادت کو جواں دیکھیں گے

اُمّتِ احمدِ مرسل کے لئے عام ہے عید اہلِ ایماں کے لئے شکر کا پیغام ہے عید
مردِ مسلم کے لئے تحفۂ اسلام ہے عید جو عوض میں ملا روزوں کے وہ انعام ہے عید

حق سے حقدار کو اللہ سوا دیتا ہے
نیک بندوں کو تو خود داد خدا دیتا ہے

وہ گلے ملنے کا انداز وہ احساسِ خوشی دلِ ناکامِ محبت کو بھی ہے پاسِ خوشی
غم کے بازار میں ارزاں ہوئے اجناسِ خوشی مسکراہٹ ہے کہ در پردہ ہے مقیاسِ خوشی

یہ مطاعم یہ ملابس یہ مشارب کا فروغ
آج بندوں میں نظر آتا ہے صاحب کا فروغ

اہلِ اسلام کو آپس میں محبت کا پیام تاحد شوق ہے تجدیدِ اخوت کا پیام
ہے یہ ایتام و مساکین[1] کی خدمت کا پیام عام ہے آج مساوات کی عظمت کا پیام

نفس کی فتح کا تسکین رساں نام ہے عید
روزہ آغازِ جہادِ بشر انجام ہے عید

عید ہی کا تھا وہ دن جب کہ رسولِ کونین گھر میں اللہ کے ناقہ بنے بہرِ حسنینؑ
تھا یہ مقصود ہو تفسیرِ حدیثِ ثقلین لوگ پہچان لیں ان کو یہ حسنؑ ہیں یہ حسینؑ

تا نہ حجت رہے باقی کوئی اُمّت کے لئے
الفتِ آل کی ہے شرطِ شفاعت کے لئے

۱۹۴۹ء

[1] اصطلاح فقہا میں یہی ترکیب مستعمل ہے۔

عشق

عشق ہے ایک رازِ حسن، حسن ہے ایک رازِ عشق — سازا گر ہے نازِ حسن، سوزِ غم نیازِ عشق

آہِ جگر سے استوار تارِ نفس کا ساز ہے — رنگِ شباب زندگی رنجِ شبِ درازِ عشق

صبر ہے ان کا بے پناہ ضبط ہے انکا بیکراں — اس لئے اہلِ درد ہیں محرمِ ساز بازِ عشق

رنج رُبا ہے میکدہ عیش فزا ہے میکدہ — اسکی فضائے بیخودی ہوتی ہے غم نوازِ عشق

گاتے ہیں فرطِ شوق سے ہم بھی تسلیوں کے گیت — وادیٔ دشت و کوہ میں بجتا ہے جب بھی سازِ عشق

آئینۂ حقیقتِ حسنِ ازل کے سامنے — نقش گرِ تصوراتِ جلوہ گہِ مجازِ عشق

"صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق"

"معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق"

۱۹۵۵ء

رباعیات

دو لفظوں میں سن لیجئے بس کیا ہے دبیرؔ[1] — فنِ سخن و شعر کا عیسیٰ ہے دبیر

یہ کر چکا ہے کتنی زمینیں زندہ (۱) — کہتے ہیں زمینوں کا مسیحا ہے دبیر

۱۹۶۰ء

اک منتہیٔ فکرِ رسا ہے اقبالؔ[2] — نطشےؔ[3] کے قبیلے کا خدا ہے اقبال

مومن بھی ہے کافر بھی ہے متشکک بھی (۲) — کوئی نہ سمجھ پایا کہ کیا ہے اقبالؔ

۱۹۶۱ء

احساس کے گلزار کا شائق ہے جوشؔ[4] — ترسیلِ خیالات کے لائق ہے جوشؔ

کر دیتا ہے تخلیق کی دنیا آباد (۳) — الفاظ کا اک قادر فائق ہے جوشؔ

۱۹۶۱ء

۱؎ مرزا سلامت علی دبیر مغفور ۲؎ علامہ اقبال مرحوم ۳؎ ایک مشہور مفکر ۴؎ حضرت جوش ملیح آبادی۔

شکست

کس نے دی پھر مرے غم خانے کے در پہ آواز
شمعِ کشتہ کو، جلا آہ! تری عمر دراز

یہ سن و سال کی لو دیتی ہوئی دھوپ بتائے
چہرے کملا گئے کیوں اجنبی کیوں ہے آواز

دو دل اس گردشِ ایام کے صحرا میں رہے
اس طرح جیسے صدا سے رہے بیگانہ ساز

آشنا ہوتے ہوئے اجنبی بنتے ہی گئے
نہ اٹھا پردۂ بیگانگیٔ ناز و نیاز

ہائے وہ عشق جو پردے میں رہا تا بہ حیات
لب تک آیا نہ کبھی بھول کے بھی جس کا راز

کوئی بائیس برس گذرے کہ اک دخترِ ماہ
جس کا چاندی کا بدن تھا کبھی سیماب گداز

جسکی آنکھوں میں مئے ناب نظر میں بجلی
شعلۂ خرمنِ احساس تھی جس کی آواز

تربیت یافتہ نظروں میں جوانی کا رچاؤ
ہر ادا جذبۂ بیتابیٔ دل کی غماز

رہزنِ ہوش و خرد کفر کا بھرپور شباب
یاد تک جس کی بنی دشمنِ اوقاتِ نماز

۱۹۶۷ء

رباعیات

(۱)

یہ پھول کی مانند پھپھکتا سا بدن
اُجلے سے دوپٹے میں یہ کالی چوٹی
بوٹا سا یہ قد حُسن کے بن کا چندن
کینچل کے لبادے میں ہو جیسے ناگن

۱۹۵۴ء

(۲)

اُٹھتی ہوئی خونریز جوانی دیکھو
گر حُسن پہ مرنے کا ہے دل میں ارمان
تنتے ہوئے خنجر کی روانی دیکھو
فرہاد کی خوں گشتہ کہانی دیکھو

۱۹۶۷ء

عصمتِ علم

علم آدمؑ کے لئے وجہ فضیلت ٹھہرا
روزِ اوّل یہی معیارِ خلافت ٹھہرا

علم سرچشمۂ تقدیس و کمالات بنا
وجہ اعزاز بنا موجبِ عصمت ٹھہرا

علم ہی نورِ ازل علم ہی عقلِ اوّل
علم اکلیل شرف خرقۂ عزت ٹھہرا

علم نے منزلِ معراج میں رکھّا جو قدم
شمعِ دیں محفلِ کونین کی زینت ٹھہرا

خود ہی اعجاز، خود اعجاز نما، علم بنا
حُسنِ وحدت نظرِ شوقِ رسالت ٹھہرا

علم لوح و قلم و صُحفِ سماوات کی روح
علم سرمایۂ آئینِ شریعت ٹھہرا

وجہ تفضیل بنا حضرتِ آدمؑ کے لئے
علم ہی جوہرِ اخلاق و شرافت ٹھہرا

علم ہی نورِ محمدؐ کی دلیل روشن
علم ہی تاجِ شرف حُسنِ نبوت ٹھہرا

علم کا شہر محمدؐ کو بنایا حق نے
نفسِ حق بابِ کمالاتِ رسالت ٹھہرا

ذاتِ حیدرؑ کی ہی جب کہ درِ علم نبیؐ
علم تب جا کے کہیں قابلِ شہرت ٹھہرا

سینۂ آلِ محمدؐ میں برنگِ اسرار
علم اللہ کی مخصوص امانت ٹھہرا

علم علّت ہے تو معلول یقینِ محکم
جانِ ایماں یہی بنیادِ شریعت ٹھہرا

وارثِ علم نبیؐ جو بھی ہوا دنیا میں
کشورِ دیں میں وہ سلطانِ امامت ٹھہرا

حاکمِ شرعِ نبیؐ جعفرؑ صادق سا امام
منبعِ جود و سخا مظہرِ رحمت ٹھہرا

دینِ جعفریہ بنا دینِ براہیمؑ تمر
مختصر یہ ہے یہی دینِ رسالت ٹھہرا

مئی ۱۹۸۰ء

مرگِ شاہنشاہی

بہارِ ساقی نامہ

آرائشِ صبوحی و جام و سبو ہے آج
کالی گھٹا کو رندوں کی خود جستجو ہے آج

نقشہ بدل دیا ہے فروغِ بہار نے
گلزارِ دہر میکدۂ رنگ و بو ہے آج

ڈھالی گئی ہے ساغرِ گل میں شرابِ حسن
لالہ سبو بدست لبِ آبجو ہے آج

مطرب یہ نغمہ باعثِ کیف و کم و سرور
ساقی بجام زینتِ بزمِ سبو ہے آج

سوسن ہے یا کہ قاریٔ قرآن میکدہ
یوں بہ زبان کیوں سبقِ شست و شو ہے آج

چھلکی ہوئی شراب کی چھینٹوں کا فیض ہے
جو روئے گل پہ شبنمِ آئینہ رو ہے آج

لائی نسیمِ صبح نویدِ شکستِ شیخ
بادہ کشی حرم میں بقیدِ وضو ہے آج

بزمِ عروسِ باغ سے کانٹا نکل گیا
ملتا نہیں ہے خار کی گو جستجو ہے آج

آباد میکدہ ہے تو ویران خانقاہ
ٹھنڈا تمام ترنشۂ یا و ہو ہے آج

سنبل نے یوں خمار کے کس بل نکالے ہیں
نرگس کی انکھڑیوں میں نشے کی نمو ہے آج

نغمہ سرا ہے بلبلِ بستانِ روزگار
بے داغ رنگِ باغ برنگِ سبو ہے آج

ممنونِ بے خودی ہوں بہ اندازۂ خرد
اک رمزِ بے پناہ مری گفتگو ہے آج

پینے سے بار بار بھی ہوتا نہیں میں سیر
دشمن کا میرے جام میں شاید لہو ہے آج

رندی ہے میری طاقتِ حق کا مظاہرہ
پیتا ہوں اور شیخ حرم دو بدو ہے آج

موقوف کچھ ثمر پہ نہیں لذتِ سرور
مرگِ شہنشہی کی خوشی چار سو ہے آج

جون ۱۹۴۹

کارل مارکس[1]

اک فکرِ مند ذہن کا پیکر ہے کارل مارکس
اک جادۂ حیات کا رہبر ہے کارل مارکس

اک مکتبِ خیال ہے فکروں کے شہر میں
اک دائرِ تجربات مکرّر ہے کارل مارکس

جس میں پناہ لیتا ہے ہر دورِ انتشار
فکرِ معاشیات کا وہ گھر ہے کارل مارکس

اک نقطۂ نظر کا ہے شارح عوام میں
اجزائے جسم ادیب ہیں اور سر ہے کارل مارکس

آسودگیٔ نوعِ بشر کی تلاش میں
اپنے محیطِ خوں کا شناور ہے کارل مارکس

سرمایہ کے حضور میں مجرم سہی مگر
مزدور کے لیے تو پیمبر ہے کارل مارکس

دیوانگانِ تاج پہ برسا جو ہر جگہ
وہ کوہِ انتشار کا پتھر ہے کارل مارکس

جس نے برہنہ پا کو بنایا ہے کجکلاہ
اس انقلابِ نو کا مقدّر ہے کارل مارکس

۱۹۶۲ء

رباعی

سر سیّد

فکروں سے نہ بحثوں سے نہ بیجا کد سے
بنتا نہیں کچھ تبصرۂ بے حد سے
ممکن نہ کسی راہنما سے تھا شمرؔ
جو کام بنا قوم کا سر سیّد سے

۱۹۶۲ء

[1] اپنے دور کا مشہور ترین مفکر اور سیاسی بصیرت کا حامل شخص۔

ہوش در فکر

یہ آسمان زمینوں پہ جو ہے سایہ فگن
کہیں سفید جبینِ ستمگراں کی طرح
کہیں یہ سُرخ ہے رخسارِ مہوشاں کیطرح
ہے نیلگوں کہیں یہ چشم دلبراں کی طرح
اسیر سلسلۂ قیدِ رنگ مثلِ چمن
قسم سلاسلِ وحدت کی اس نے کھائی ہے   یہ آسمان بہرحال اک اکائی ہے

مگر زمین جو ہیں اس کے زیرِ سایہ آج
وہ رنگ روپ کی عاشق حدوں کی شیدائی
تماشہ بن کے خود اپنی ہیں یہ تماشائی
تباہ کرنہ دے ان کو غرورِ خود رائی
اسیر قوم و وطن ہیں اسیرِ رسم و رواج
حریفِ پنجہ فگن آج بھائی بھائی ہے   زمیں بانٹنے کی فکر رنگ لائی ہے

بنام امن بھرجا ہے جنگ شعلہ نواز
مذاق فتنۂ ابلیس تیری عمر دراز!

۱۹۶۳ء

سیکولرزم

سیکولرزم اک تصور ہے اک نام ہے — قومی یکجہتی کا یعنی پیغام ہے
دلفریب و حسیں اتحاد آفریں — وجہ امن و بقا عیش کا جام ہے
آپسی میل کا دلنشیں مشغلہ — نوعِ انساں کی خاطر بڑا کام ہے
اہلِ ہند آج بھی سوچ لیں کاش یہ ! — امن ہی عشقِ باہم کا انعام ہے

ہر ترقّی کی بنیاد ہے سیکولرزم
اہلِ ہوش و خرد کا یہ پیغام ہے

۱۹۸۲ء

ہرکس بخیالِ خویش

ایک کورِ خرد کلام اس طرح کرتا تھا پکار — کالا سورج ہم نے دیکھا ہے فلک پر بار بار
ایک بہرے نے کہا ہم نے سنا ہے صاف صاف — آجکل انگلینڈ و امریکہ میں گہرا اختلاف[۱]
اک جذامی نے کہا ناخن اگر بڑھ جائیں گے — زخم سے لے کر مزے ہر لحظہ ہم کھجلائیں گے
دوڑ میں ہم لیں گے حصّہ ایک لنگڑے نے کہا — جائیں گے مرّیخ پر ہم اک ٹنگڑے نے کہا

مختصر یہ ہے کہ ہر عیبی ستم ایجاد ہے
ویسا وہ ہے جیسی اسکی طبع کی افتاد ہے

۱۹۸۱ء

۱؎ بہرے نے اختلاط کو اختلاف سمجھا۔

مرا دِل مجھ سے نہ چھینو

شمشاد قدو۔ لالہ رُخو۔ زہرہ جبینو
گم گشتۂ صحرائے ادا ساز حسینو

شادابیٔ رُخ۔ دولتِ رعنائی ہے فانی
عشرتکدۂ ناز کے مغرور مکینو

سوچو تو سہی رہزنیٔ ہوش کا انجام
اے گوہر صد رنگ کے پُرکار دفینو

جب کر نہ سکو اُس کی تسلّی کا تحفظ
کہتا ہوں خدارا مرا دل مجھ سے نہ چھینو

۱۹۶۳ء

تائیدِ غیبی

اُمیدوں کی دنیا میں یہ ہے یاس کی تصویر
ہر دور کا فنکار ہے افلاس کی تصویر

شائع ہو کلامِ شعرا آسان نہیں تھا
غالبؔ کا یہ یا میرؔ کا دیوان نہیں تھا

فنکار کو پہچاننے والا نظر آیا
کام اپنا تہِ بخت کہ بنتا نظر آیا

کچھ اہلِ ادب صاحبِ اخلاص و شرافت
سرمایہ بکف آ گئے لئے عزم کی دولت

سرمایہ سخاوت کے ہوا جیب سے پیدا
سامانِ طباعت کا ہوا غیب سے پیدا

۱۹۶۲ء

تتلی

(بچوں کیلئے ایک نظم)

نازک نازک پیلی پیلی　　پیاری پیاری نیلی نیلی
رنگ برنگی تتلی دیکھو　　اُجلی کالی تتلی دیکھو
اپنے کو یہ کھو دیتی ہے　　پھول میں رنگ سمو دیتی ہے
پنکھ پہ اس کے پھول بنے ہیں　　پھولوں میں ترشول بنے ہیں
باغِ قدرت کا یہ سُمن ہے　　ہلکا پھلکا اس کا بدن ہے
باغ کا کونا کونا گھومے　　تتلی پھولوں کا مُنھ چومے
پھُر پھُر پھُر آتی جاتی ہے　　بچوں کو یہ دوڑاتی ہے

سن ۱۹۷۳ء

تکیہ

لگائے بیٹھا ہے پہلو سے گلبدن تکیہ　　لئے ہے گود میں شادابیٔ چمن تکیہ
ہر ایک زاویۂ چشم کی زبان پہ ہے　　دکھا رہا ہے حسینوں کے بانکپن تکیہ

سن ۱۹۷۲ء

رباعی

سینے پہ طربناک کسی چولی ہے　　یا بنتِ صنم گرنے دُکاں کھولی ہے
اے چشمِ گنہ گار ذرا غور سے دیکھ　　لڑکی ہے کہ یہ حُور کی ہمجولی ہے

سن ۱۹۷۴ء

وطن کا گیت

پیارا وطن ہمارا پیارا وطن ہمارا

جوشِ خوشی میں لب تک یہ بات آگئی ہے
ہندوستاں کی عظمت دِل میں سما گئی ہے

جنّت کا ہے نمونہ سارا وطن ہمارا

پیارا وطن ہمارا پیارا وطن ہمارا

حسنِ ہمالہ دیکھو گنگ و جمن کو دیکھو
بھارت کی سبھیتا کے پیارے چمن کو دیکھو

آنکھوں کا ہم سبھوں کی تارا وطن ہمارا

پیارا وطن ہمارا پیارا وطن ہمارا

کھیتوں کی لہلہاہٹ چڑیوں کی چہچہاہٹ
باغوں میں ہر جگہ یہ پھولوں کی مسکراہٹ

دل سب کے کھینچتا ہے نیارا وطن ہمارا

پیارا وطن ہمارا پیارا وطن ہمارا

دیوالی، عید، ہولی اور کرسمس کے میلے
یہ کھیل کود پڑھنے لکھنے کے یہ جھمیلے

ہے پریم کی ندی کا دھارا وطن ہمارا

پیارا وطن ہمارا پیارا وطن ہمارا

۱۹۶۱ء

قطعہ

یہ پھبکتے ہوئے پودے یہ لچکتے ہوئے نخل
یہ گلستاں کی ہیں آئندہ بہاروں کے نقیب

جھلملاتا ہوا آتا ہے نظر اے ہمدم
اِک ستارہ اُفقِ صبحِ تمنّا کے قریب

۱۹۶۱ء

قطعات

(۱)
جیسے وقتِ شام سایہ سرخیٔ خورشید کا
یونہی میرے غم کی راتوں میں مرے دل کا لہو
ریل کی پٹری کے پاؤں میں لگاتا ہے حنا
جگمگا دیتا ہے تیری یاد کا ہر راستا
سن ۱۹۶۰ء

(۲)
تصوّرِ غمِ عہدِ شباب باقی ہے
دمِ سحر بھی مرے ساغرِ شکستہ میں
افق کے پیچھے ابھی آفتاب باقی ہے
نمودِ قطرۂ صہبائے ناب باقی ہے
سن ۱۹۶۲ء

(۳)
گلے لگا لیا وحشت میں چاک دامن کو
وہ سادہ لوح ہیں دنیا کو معتبر سمجھے
بہار آنے کا ہم انتظار کر نہ سکے
نظر کا اپنی مگر اعتبار کر نہ سکے
سن ۱۹۵۸ء

رباعیات

(۱)
دنیا کا عجب رنگ ہے سن لے ناداں
جینے کی ہوس تجھکو اگر ہے اب بھی
لازم ہے مہیّا کر ابھی سے ساماں
تو شیخ و برہمن کی ملا ہاں میں ہاں
سن ۱۹۶۰ء

(۲)
جذبات کے مابین ٹھنی ہے اکثر
دیکھا ہے یہ ارباب بصیرت نے مگر
اغیار سے بھی ہم سخنی ہے اکثر
تدبیر سے تقدیر بنی ہے اکثر
سن ۱۹۶۵ء

(۳)
کرتی ہے ترے حسن کو جب پیار نگاہ
ناوک کی طرح دل میں یہ چبھ جاتی ہے
گر گر کے اُٹھا کرتی ہے سو بار نگاہ
ہو جاتی ہے کچھ اور طلبگار نگاہ
سن ۱۹۶۲ء

تنقید کا المیہ

تنقید کو تاریخ سمجھ بیٹھے بعض
ہر قول کی تشریح سمجھ بیٹھے بعض

کچھ سمجھے کہ ہے منھ کا نوالہ تنقید
اقوالِ اکابر کا حوالہ تنقید

کچھ سمجھے تمدّن کا یہ آئینہ ہے
یا گوہرِ تہذیب کا گنجینہ ہے

الفاظ کی تشخیص کا تنقید ہے نام
کچھ سمجھے کہ معنی کا ہے مقصود ابہام

بعضوں نے کہا جائزۂ مقصد ہے
اک طرح کا اندازۂ نیک و بد ہے

اکثر نے اسے وقت کی تحریک کہا
خود ساختہ پرداختہ تکنیک کہا

فن نعرہ ہے اور نعرۂ فن بیچارہ
یہ نفس ہر اک حال میں ہے امّارہ

کچھ لوگ یہ سمجھے کہ ہے اصلاحِ کلام
استادوں میں لکھ جائے ہمارا بھی نام

کچھ سمجھے کہ معیارِ زباندانی ہے
یہ بتکدۂ نوکِ قلمِ مانی ہے

مغرب زدگی فرض ہے کچھ کے نزدیک
طولِ مرضِ غرض ہے کچھ کے نزدیک

کچھ سمجھے غلط لاکھ سہی پھر بھی کلام
محبوب ہے دیتا ہو جو تخئیل کا جام

کچھ سمجھے کہ تنقیصِ گل و بلبل ہے
کچھ سمجھے کہ تعریفِ سبو و خُم ہے

بعضوں نے کہا ریت پہ سورج کی کرن
بھر دیتی ہے تنقید کا پھیلا دامن

کچھ سمجھے ارسطو و عروضی و رشیق
معصوم ہیں اور فکر بھی ہے ان کی عمیق

گمراہ ہوئے سن کے بیانِ حالی
کچھ کرنے لگے اگلوں کی بس نقالی

کچھ سمجھے جو اٹس کو کہ پیغمبر ہے
گیٹے ڈکروچے کے مزامیر کمال
روسو کی نظر مارکس کا اندازِ نگاہ
کچھ سمجھے کہ کچھ کہئے سبھی کہتے ہیں
بعضوں کا عقیدہ ہے فرائڈ کی نظر
فیشن کے تقاضوں پہ عمل ہے تنقید
اکثر کے لئے ندرتِ افکار کا جام
کچھ کہئے دلیل اسکی ضروری کب ہے؟
کچھ کے لئے سروس کا ذریعہ یہ ہے
کچھ سمجھے کہ ہم دیں گے کسی کو جو ریمارک
کچھ سمجھے کہ ہے لوگوں کی تائید ضرور
کچھ سمجھے کہ ہر ایم۔اے تو قابل ہوگا
کم ذہن سند لیکے نکلتے ہیں کبھی
کچھ لوگوں کا اک بُتِ پندار نما
اندھوں کی جماعت میں ہے ہاتھی تنقید
تقلید پرستانِ دیارِ افکار
ناواقفِ اسرار و رموزِ تنقید

انگلیز کا ڈانٹے کا یہ جب ہمسر ہے
ہر بزم میں ہیں آج ہم آوازِ جمال
شدّت سے ہے ہر ردِّ عمل کے ہمراہ
تنقید کے دریا میں سبھی بہتے ہیں
جنسیّت آدم کی ہے نبّاض مگر
کچھ اور ہے آج اور ہی کل ہے تنقید
جو دے ہے وہی میکدۂ فن کا امام
ہم مانیں نہ جب، بات ادھوری کب ہے؟
کچھ کے لئے بیکار وطیرہ یہ ہے
بن جائیگا وہ شیشۂ تنقید کا کارک
تقلید کی پابند ہے تنقید ضرور
سوچا نہ کبھی یہ کہ وہ ناقل ہوگا
کمزور سے کچھ پیڑ بھی کھلتے ہیں کبھی
تنقید بھی ہے نقشِ بدیوار نما
مانند عصا لمس کی ساتھی تنقید
ہر مکتبِ تخئیل میں ملتے ہیں ہزار
دریوزہ گرِ بابِ مکانِ تائید

کاندھے پہ لئے پھرتے ہیں تنقید کی لاش
مرقد کے لئے کرتے ہیں کاغذ کی تلاش

عقلوں پہ یہ چڑھائے ہوئے بوسیدہ غلاف
کٹھ حجتی کی تیغ سے کرتے ہیں مصاف

ذوقِ ہمہ دانی کا ڈھنڈورہ یہ ہے
شہرت کے فقیروں کا کٹورہ یہ ہے

کرتا ہے اگر کوئی بھی تنقیدِ صحیح
بن جاتی ہے اس عالمِ دانا کی ضریح

تنقید ہے کیا پھر ہے سوال موجود
حل اسکا دماغوں سے ہے اب تک مفقود

تنقید عقیدہ نہیں تجزیہ ہے
سمجھے نہ اسے لوگ یہ المیہ ہے

احساسِ جمال آبروئے قدرِ کمال
ہر غم کے سمجھنے کی صلاحیتِ حال

انسان کی فطرت کی ہے یہ نبّاضی
پیوندیٔ مستقبل و حال و ماضی

اندازِ نگارش میں زبان اور بیاں
ہے آئینۂ حسنِ بصیرت کی جاں

دل آئینہ، انصاف کے قابل ہو دماغ
تب جا کے سنورتا ہے یہ تنقید کا باغ

۱۹۶۳ء

محنت کش

تری تقدیر میں اے باربردارِ غمِ انساں
کبھی گرمی کی شدت ہے کبھی بارانِ ژالہ ہے

بجز مزدور جوئے شیر لا سکتا نہیں کوئی
کہ یہ بھی کوہکن کا ہم نوالہ ہم پیالہ ہے

۱۹۶۲ء

رباعی

اخباروں میں لکھنے کے بھی شوقین بنو
تنہا نہ رہو ایک سے دو تین بنو

انسانوں کی کیا قدر، ہے سائنس کا دور
شہرت کو جنم دے جو وہ ماشین[۱] بنو

۱۹۶۲ء

[۱] مشین کو فارسی میں ماشین کہتے ہیں۔

سہرا

(بہ تقریب شادی خانہ آبادی برخوردار حبیب الحسن سلمہٗ نبیرۂ جنت مکاں سید ریاض الحسن مرحوم)

"زہے کہ باغِ ریاض الحسن میں آئی بہار
خوشا کہ ہے دلِ فضّہ نمونۂ گلزار

خدا کا شکر محب الحسن ثمر کا پسر
بنا ہے نوشہ حبیب الحسن خجستہ سیر

جناں میں خوش ہیں جو عبدالعلی تو اختر شاد
نہالِ ارم میں ہیں صابر حسین نیک نہاد"

یہ قصرِ خلد بریں میں بہ فضلِ ربِّ علا
علی حسن سے ریاض الحسن نے فرمایا

"حفاظت و علی حیدر کے ساتھ انوارل
ہیں شاد جیسے ذکی احمد اور اظہارل"

"سرور میں ہیں جو اطہر اور رئیس و ظہیر
تو خوش ہیں اصغر و منظور اور نذیر و صغیر"

"وصی و عالم و مالے، مرید اور فرید
وہ مسکراتے ہیں زوّار و شبیر و خورشید"

"وہ دیکھو فہم کے ہمراہ جانشین احمد
براتی بن کے چلے لے کے شوقِ دلِ بے حد"

"وہ پھوپھیاں، دولھا کی بہنیں، ممانیاں، چچیاں
دولھن سنوارنے جاتی ہیں دادی ساتھ ہے ماں"

"تمہاری دختر افضل کا دلپذیر پسر
ہمارے بیٹے کا فرزند جو کہ ہے اکبر"

"اسی کے عقد کی شادی کی دھوم دھام ہے یہ
نبیؐ و آلِ پیمبرؑ کا فیضِ عام ہے یہ"

"یہ خاندان کے پوتوں کی پہلی شادی ہے
خوشی خدا کی عطا کردہ ہے مرادی ہے"

"میں چاہتا ہوں کہ سہرا لکھے ثمر اس کا
سرورِ قلب کا باعث بنا پسر اس کا"

سرِ حبیب پہ ہے جانِ کہکشاں سہرا
سنا دے بزم کو اے قسمتِ جواں سہرا

جو لوگ سورۂ اَلحَمد پڑھ کے باندھتے ہیں
اسی سے دیتا ہے جذبات کو اماں سہرا

نگاہِ بد سے ہے نوشاہ ہر طرح محفوظ
کہ رُخ پہ مقنع ہے مقنع پہ جانستاں سہرا

جو آفتاب ہے دولھا تو ماہتاب دولھن
دکھا رہا ہے کوئی منظرِ قِراں سہرا

بحورِ شوق کے موتی ریاضِ حُسن کے پھول
بنا ہے میل سے دونوں کے ضو فشاں سہرا

یہ عقدِ حکمِ خدا، اسوۂ پیمبرؐ ہے
کہ جسکی ایک علامت ہے بے گماں سہرا

نہ جانیں کتنی تمنّائیں بن گئیں مالن
گندھا ہے تب کہیں جا کر قرارِ جاں سہرا

چچا کو باپ کو ماموں کو اور پھوپھا کو ملا
بہ بزمِ عیش بصد شوق نغمہ خواں سہرا

خوشا کہ کھلتا ہے دادی کا غنچۂ خاطر
جما جما کے نظر دیکھتی ہے ماں سہرا

شمیمِ گیسوئے تہذیب سے معطر ہے
سماج کی ہے زمانے میں داستاں سہرا

عزیز اور اقارب نہ کیسے شاد ہوں آج
بنا ہے باعثِ تنشیطِ خانداں سہرا

طفیلِ سرورِ عالم سدا بہار رہے
بہ فیضِ آلِ نبیؐ ربِّ دو جہاں سہرا

ثمرؔ کے واسطے ہے فن کی شاہراہوں میں
زہے نصیب کہ تسکینِ روح و جاں سہرا

۵ جنوری ۱۹۶۲ء

رُباعی

مطلب نہ کسی ازم نہ ہے اپنیت سے
کرتا آیا ہوں مانگی ہوئی اہمیت سے
کرتے ہیں سہاروں کی اپاہج ہی تلاش
میں تیر رہا ہوں اپنی انانیت سے

۱۹۶۲ء

نیشن بلڈرس

(انگریزی سے ترجمہ)

زر نہیں صرف یہ انسان بنا سکتے ہیں
قوم کو مضبوط و عظیم

بہرِ اعزاز و صداقت جو اٹھا سکتے ہیں
عزم سے رنج سقیم

وہ بہادر ہیں جو اسوقت میں کرتے ہیں کام
دوسرے جب سوتے ہیں

کرتے ہیں ایسے میں ہمت جب اُڑ بچھو سے عوام
اور کہیں ہوتے ہیں

گاڑتے ہیں وہ ستون قوم کا گہرائی تک

اور لیجاتے ہیں اونچا اُسے تا حدِ فلک

(آر۔ ڈبلو۔ ایمرسن)

۱۹۶۳ء

مزدور

سرمائے کا خلّاق ہے یہ مردِ ہنرمند
ڈرتا نہیں سرمائے سے توحید کا فرزند

سونے کے خدا ہوں کہ وہ چاندی کے صنم ہوں
مزدور کے پاؤں پہ بھلا کیسے نہ خم ہوں

مزدور بناتا ہے انہیں اِن کا ہے خالق
اور زر کے پجاری کے یہ اصنام ہیں رازق

ہے فاقہ کش و رنج کش و مفلس و مجبور
ہر دور کا مزدور بہر حال ہے مزدور

مزدور کی آہیں ہیں کہ چمنی کا دھواں ہے
گھڑ گھڑ ہے مشینوں کی کہ بیکس کی فغاں ہے

ڈرتا ہوں کہ اُٹھ کر یہ قیامت نہ اُٹھائیں

حیدر[1] کی طرح پرچم وحدت نہ اُٹھائیں

۱۹۶۲ء

[1] مولا علیؑ جو تمام عمر مزدوری سے اپنا آذوقہ مہیا فرماتے رہے۔

اسٹرائک

(طنز مستزاد)

صبح منھ اندھیرے ہی ناشتہ پکا دینا - اور پھر دعا دینا
جانا ہے پکٹنگ پہ بچوں کو بتا دینا - بات یہ سکھا دینا

سننا تم محلے میں، میں ہوں اور مالک ہے - آج اسٹرائک ہے
مانگ کی لڑائی کو عام یوں کرا دینا - تم اسے ہوا دینا

حق ملے گا ناحق سے بات یہ پرانی ہے - یہ ڈگر بھی جانی ہے
چلتے کو بٹھا دینا بیٹھے کو چلا دینا - کام سے لگا دینا

رسم چل پڑی ہے جو ہر جگہ یہ جاری ہے - "مانگ یہ ہماری ہے"
پوری جب کہ ہوں مانگیں پھر سوال اٹھا دینا - برہمی بڑھا دینا

شہر کے اداروں کے کام کاج ہوں گے بند - کھا کے کہتے ہیں سوگند
ہے کسی سے کیا لینا اور ہمیں ہے کیا دینا - بات بس بنا دینا

ہم لگائیں گے نعرہ زور شور سے ہر دم — تم نہ کیجیو کچھ غم
جیل بھی جو جائیں ہم سن کے مسکرا دینا — عزم یوں دکھا دینا

مئی ۱۹۶۲ء

یک جہتی

(طنزیہ)

یکجہتی کی تھالی کی یہ جھنکار ہے پیاری
احباب کی من موہنی گفتار ہے پیاری

طبقات کی حد بندی بُری چیز ہے لیکن
کس طرح سے ہم توڑیں یہ دیوار ہے پیاری

دامن سے اُلجھتی ہے بہر گام تو کیا ہے
خواہش میں گلوں کی روشِ خار ہے پیاری

ہم کہتے رہیں کچھ وہ کریں جس میں بھلا ہو
کہتے ہیں سیاست کی بُری مار ہے پیاری

ہم خوگرِ نعرہ ہیں کوئی نعرہ ملا تو
بے روح سے نعروں کی یہ پھٹکار ہے پیاری

جب جیل کے آثار کا کوسوں نہ پتہ ہو
ایسے میں یہ ظاہر طلب دار ہے پیاری

یکجہتی کی عظمت پہ یقیں رکھتے ہوئے بھی   فرقوں کی یہ تفریق گنہ گار ہے پیاری
یہ مانا کہ یکجہتی پہ بنیادِ بقا ہے   لیکن عبث آپس کی یہ تکرار ہے پیاری

ہے فرق بہت قول و عمل میں کہ ہے کردار
بہ صورت وقت اور یہ گفتار ہے پیاری

۱۹۸۳ء

تصویرِ وقار

(طنز)

مرے محلّے میں
رہتے ہیں ایک صاحب جو
یہ کیا؟
کہ ان کے اب و جد کو جانتا ہوں میں
یہ پست نسل ہیں، احساسِ کمتری کے شکار
پڑھے لکھے
یہ فقط واجبی کڑھے ہیں بہت
زمانہ سازیوں
کی چالوں سے یہ واقف ہیں
گداگرانِ تفاخر کے یہ مصاحب ہیں

یہ پہلے مجھ سے بہت دور تھے
مگر اب کے
جو اتفاق سے کرسی اسمبلی میں مجھے
ملی بہ منتِ غیرے
تو اب یہ پھرتے ہیں
سایہ بنے ہوئے میرا کہ جانتے ہیں
لہو مرا کام آئے گا
جو یہ بنائیں گے اپنے وقار کی تصویر

۱۹۷۳ء

میر تقی میرؔ

میر تقی میرؔ کا لب پہ اگر آیا نام
نطقِ ادب نے کئے جھک کے ہزاروں سلام

میکدۂ فکر و فن جھوم اٹھا، رقص میں
بادۂ تخیّل کا آگیا خوش رنگ جام

میرؔ کا کیا پوچھنا غالبؔ و ناسخؔ کے ساتھ
ذوقؔ پکارے کہ ہے خالقِ حسنِ کلام

فطرتِ انساں کا ہے میرؔ وہ نبّاضِ خاص
واقفِ اسرارِ قلب جو ہے بحدِّ تمام

خالقِ انداز ہے، شعر کا پروردگار
دِل کا پیمبر ہے یہ فنِّ سخن کا امام

کعبۂ فن ہے گواہ بزمِ سخن ہے گواہ
حلقۂ فنکار میں میرؔ کا ہے احترام

میرؔ کے دیوان کی خونِ جگر سے نمود
ہے یہ یقینِ خواص یہ ہے خیالِ عوام

محفلِ اشعار میں میرؔ ہی بس میر ہے
میرؔ امیرِ سخن میرؔ رئیسِ کلام

۱۹۷۲ء

خیابانِ غزل

(۱)

شبِ ہجر میرا ہمدم نہ رہا کوئی ستارا
تمہیں کیا ملا گھٹاؤں! مرا توڑ کر سہارا

مجھے دِل کے ٹوٹنے کا نہ الم ہو کیوں گوارا
ہوئے ایک سے ہزاروں ترے جلوے آشکارا

یوں ہی غم میں دن گذارو کہ ہے آجتک گذارا
نہیں بحرِ غم کا ہوتا ہے ثمر کوئی کنارا

(۲)

دردِ غمِ فراق کا درماں نہ ہو سکا
اپنے کئے پہ خود میں پشیماں نہ ہو سکا

دل مائلِ خیالِ صنم تھا طواف میں
کافر تمام عمر مسلماں نہ ہو سکا

فرصت ملی نہ کشمکشِ زیست سے کبھی
آوارہ گردِ کوچۂ خوباں نہ ہو سکا

ہر چند سعیٔ تجزیۂ زیست کی مگر
عقدہ مری حیات کا آساں نہ ہو سکا

ضبطِ الم سے غنچۂ دل تنگ رہ گیا
مانندِ بوئے گل میں پریشاں نہ ہو سکا

سب کچھ دلِ غریب سے ممکن ہوا مگر
بس انبساطِ زیست کا ساماں نہ ہو سکا

(۳)

ترے وعدے کا ستمگر جو نہ اعتبار ہوتا
تو جلا کے شمعِ ہستی نہ یوں انتظار ہوتا

بھری بزم میں نقابِ رُخ اگر اٹھاتا کوئی
تو قیامت آہی جاتی بڑا خلفشار ہوتا

میں قدم قدم پہ مرتا میں قدم قدم پہ جیتا
ترے جبر پہ مجھے بھی اگر اختیار ہوتا

تری جلوہ گاہ تک میں چلا آیا بن بلائے
کہ میں ننگِ آرزو تھا مجھے کیسے عار ہوتا

مجھے جینے دی نہ دیکھا کبھی لطف کی نظر سے
یہی تیر رہ گیا تھا جو جگر کے پار ہوتا

مرے بعد زندگی بھر ثمرؔ ان کو بھی یقیناً
یہ رہے گی ایک حسرت کوئی جاں نثار ہوتا

۱۹۵۲ء

(۴)

حیات خود ہی فریبِ حیات ہے شاید
لباسِ صبح میں ملبوس رات ہے شاید

جو اک خلش سی دلِ غمزدہ میں ہے اب تک
امیدِ یک نگہہ التفات ہے شاید

۱۹۵۳ء

(۵)

اثر طرازِ غمِ روزگار ہے شاید
کہ کم کم آج مجھے فکرِ یار ہے شاید

فریبِ دیر و حرم ہے یہاں تو بغض و حسد
یہ میکدہ ہی مجھے سازگار ہے شاید

رقیب آج بھی ہیں اُنکی بزم کی رونق
کسی کسی کو ابھی اعتبار ہے شاید

سکونِ روح و بدن روزِ ہجر میں ہے کہاں
شبِ وصال کا اب تک خمار ہے شاید

ٹپک رہا ہے لہو فرشِ میکدہ پہ ثمرؔ
وہ رندِ خاص ابھی بالائے دار ہے شاید

۱۹۵۴ء

(۶)

حریفِ صورتِ اغیار بن گئی تقدیر
ترے ستم کی طرفدار بن گئی تقدیر

یہ وقت وقت کی ہے بات اسکو کیا کہئے
کبھی گُل اور کبھی تلوار بن گئی تقدیر

خدا کی شان وسیلے تلاش کرتا ہوں
رہینِ منتِ اغیار بن گئی تقدیر

۱۹۵۵ء

(۷)

اللہ اللہ یہ عالم ہے بہار آنے پر
انگلیاں اٹھنے لگی ہیں ترے دیوانے پر

میری مٹی بنی صورتگرِ جام و مینا
میرا احسان ہے ساقی ترے میخانے پر

غم جسے کہتے ہیں وہ دل کا ہے احساسِ لطیف
منحصر شدتِ غم کچھ نہیں افسانے پر

۱۹۵۶ء

(۸)

نامکمل ہیں محبت کے حسیں افسانے
دورِ صحرا سے ابھی تک ہیں ترے دیوانے

میں نے چاہا کہ چلوں سوئے گلستاں لیکن
وحشتِ عشق پہ آوازے کسے صحرا نے

عشق و الفت کے روایات مٹائے نہ مٹے — شمع کے گرد رہے تا بہ سحر پروانے

مجھکو وہ عشق تھا انگور کی بیٹی سے کہ روز — یاد کرتے ہیں سرِ شام مجھے میخانے

حق پرستی کا یہ اعلان یہ اندازِ فریب — واعظا ہاتھ میں تسبیح کے سو سو دانے

اس لئے دور رہوں میں محفلِ جاناں سے شرر — نگہِ چشمِ عنایت نہ مجھے پہچانے

۱۹۵۶ء

(۹)

رحمتوں کو تری گواہ کئے — سچ تو یہ ہے بڑے گناہ کئے

اے محبت ترا برا ہو جائے — تو نے کتنوں کے گھر تباہ کئے

پاس اب مفلسوں کے کچھ بھی نہیں — دل جگر نذرِ بارگاہ کئے

جبکہ نازک ہیں میرے احساسات — تجھ سے شکوے یہ خوامخواہ کئے

اس نے پوچھا جو حالِ دل میرا — کہہ نہ پائے بغیر آہ کئے

ہم ترا انتظار کرتے ہیں — اپنی آنکھوں کو فرشِ راہ کئے

کام کیونکر بنے بتاؤ شرر — غمِ دل سے بلا نباہ کئے

۱۹۵۸ء

(۱۰)

یہ بیٹھے بیٹھے کس کا خیال آگیا مجھے — ہے کون پردہ دار جو تڑپا گیا مجھے

دونوں طرف تھیں دل کے لبھانے کی صورتیں — دیر و حرم کے بیچ میں غش آگیا مجھے

خود مجھ سے تنگ آ کے غمِ روزگار آج — دشتِ جنونِ عشق میں پہونچا گیا مجھے

گذرا ادھر سے جو بھی لئے زندگی کے پھول — پتھر سمجھ کے راہ کا ٹھکرا گیا مجھے

ممکن نہ تھا علاج مرے جذبِ شوق کا — مجبور ہو کے عشق کو سونپا گیا مجھے

مجھکو تری تلاش رہی تو نہ مل سکا — غم کو مری تلاش تھی غم پا گیا مجھے

افکارِ دو جہاں سے شرر کچھ غرض نہیں — اچھا ہوا کہ عشق ہی راس آگیا مجھے

۱۹۵۹ء

(۱۱)

پسِ مرگ آتشِ غم کا دھواں باقی نہیں رہتا — سرِ منزل غبارِ کارواں باقی نہیں رہتا

نشانِ قبر کے مٹنے کا ماتم کس لئے اے دل — کسی کا تا ابد نام و نشاں باقی نہیں رہتا

مطابق ہو نہ جب تک اپنی رودادِ محبت سے

شکوۂ دردِ غمِ عشق نفس گیر بھی تھا

صحنِ زنداں میں نہ تھا صرف جنونِ مانعِ رقص

ناوک افگنِ غمِ دوراں تھا سوئے دل لیکن

کچھ تو مجبور تھے ہم فرطِ الم سے اور کچھ

فردِ ناکامیٔ تدبیرِ مسلسل میں ثمر

(۱۳) مجھے اپنے سے بھی بیگانہ کر دے

نہ کھل پائے مرا رازِ محبت

یہی اچھا ہے مجھ کو عشق کا غم

تمہیں یہ بدگمانی رفتہ رفتہ

ثمر کو اے چراغِ حسنِ جاناں

(۱۴) نورِ جناں ہے اور نہ پری ہے حجاب میں

ہم تو اسے فریبِ مسلسل سمجھتے ہیں

اک حرفِ آرزو کو فسانہ بنا دیا

ہم لٹ گئے ہیں کوچۂ احباب کے قریب

اک بار اتفاق سے شیخِ حرم کے ساتھ

غم کے عوض ہے اک غمِ تازہ کی آرزو

ہم کم نہ تھے رقیب سے یوں تو کبھی ثمر

(۱۵) دیوانہ ہوں میں بھی تری جادو نظری کا

دل ہاتھ میں لیتے ہو مگر یہ بھی سمجھ لو

ثمر لطفِ حدیثِ دیگراں باقی نہیں رہتا ۱۹۷۰ء

(۱۲) اس پہ طرہ کہ مجھے غرّۂ تقریر بھی تھا

احترامِ ستمِ حلقۂ زنجیر بھی تھا

انھیں سوفاروں کے جھرمٹ میں ترا تیر بھی تھا

دشمنِ ضبطِ وفا نالۂ شبگیر بھی تھا ۱۹۶۱ء

ایک الزام بنامِ غمِ تقدیر بھی تھا

خدا کے واسطے دیوانہ کر دے

محبت کو مری افسانہ کر دے

رہینِ بادہ و میخانہ کر دے

مری جانب سے لے پروانہ کر دے ۱۹۶۴ء

حریفِ الفتِ پروانہ کر دے

لپٹی ہوئی ہے ایک قیامت نقاب میں

کیا رائے آپ کی ہے محبت کے باب میں

اک بات بڑھ گئی ہے سوال و جواب میں

ہے اس کا غم مکیں دلِ خانہ خراب میں

ہم بھی بہک چکے ہیں شبِ ماہتاب میں

اس کے سوا کچھ اور نہیں انقلاب میں ۱۹۶۸ء

لیکن نہ آسکے نگہِ انتخاب میں

مجھ کو بھی مرض ہو گیا آشفتہ سری کا

آسان نہیں کام کوئی شیشہ گری کا

انسان کے سایہ سے بھی ہونے لگی وحشت
میں خوش ہوں، سلامت ہیں ابھی تک مرے ناخن

کیا جانے کوئی ہم پہ جو اس ماہ میں گذری
یہ بازیٔ عشق اور یہ تقدیر کے پالے

ماہِ رمضاں آگیا اے واعظِ بدبیں
رندانِ بلانوش کی فہرست بنا لے

دو چوٹیاں اس ماہ کے سینے پہ پڑی ہیں
اک چاند کے گرد آج نظر آئے دو ہالے

رادھا کی طرح سانولی رنگت کی جوانی
آنچل میں چھپائے ہوئے گوکل کے شوالے

جب بارشِ ناوک ہو کسی شوخ نظر سے
ایسے میں ثمر کیسے کوئی دل کو سنبھالے

(۱۷)

جنوں سے ہم نے بقیدِ خرد جو کام لئے
تو مجھ سے جیب و گریباں نے انتقام لئے

ہوس نے روپ بھرا پیار کا تو پھر کیا تھا
دیارِ حسن کے ذروں نے بھی سلام لئے

رقیب سے کوئی پوچھے کہ بہرِ قتل اس نے
تمہارے بعد سبھی کس کے کس کے نام لئے

بکا کسی کا دلِ ناتواں سرِ بازار
کسی نے خلوتِ جاناں میں جا کے دام لئے

اُٹھے ہیں محفلِ صد رنگ سے بھی ہم اکثر
لبوں کے بیچ کوئی عرضِ ناتمام لئے

ثمر جو چاہا کبھی جانب چمن جانا
زمینِ دشت نے خود میرے پاؤں تھام لئے

(۱۸)

اظہارِ محبت میں کروں تجھ سے تو کیونکر
رسوائی کا خطرہ بھی ہے توہین کا بھی ڈر

اس سانس پہ قربان حیاتِ ابدی ہے
وہ سانس جو ہے خوشبوئے گیسو سے معطر

بیکار کئے دیتا ہے آواز کا جادو
مرنا بھی ہے مشکل مجھے جینا بھی ہے دوبھر

پھر جاگ رہی ہے تری خوابیدہ جوانی
اے فتنۂ عالم تو ذرا دیکھ یہ منظر

یوں چاہنے والوں سے تو پردہ نہیں ہوتا
آجا بھی سرِ شام کبھی بام کے اوپر

دل ہے کہ محبت میں ہے بے چین شب و روز
اک درد ثمر ہم نے عبث مول لیا ہے

(۱۶)

جب ذہن کے کمرے میں خیال آیا پری کا
محتاج نہیں زخم جگر دادگری کا
غم ہم نے اٹھایا ہے ثمر بے پدری کا
جو دادِ وفا دے وہی خود دادِ وفا لے

۱۹۶۵ء

۱۹۶۶ء

۱۹۶۷ء

۱۹۶۷ء

(۱۹)

عاشقوں کا نہ کوئی پاس کیا — چاہنے والوں کو اُداس کیا

صرف اکبار زندگی بھر میں — دلِ ناداں نے التماس کیا

ہم نے رنگینیٔ محبت کا — داغِ دل دیکھ کر قیاس کیا

چاک دامانیوں سے تنگ آکر — زیبِ تن آخری لباس کیا

میکدے میں بشر نے کل شب کو — سنتے ہیں واعظوں کا پاس کیا

۱۹۷۵ء

(۲۰)

تشنگی حسن کی تلوار کا پانی مانگے — روز اک خون تری اُٹھتی جوانی مانگے

نقشِ آواز تو محتاجِ قلمکار نہیں — دادِ فن، کس بُتِ بے رنگ سے مانی مانگے

ندرتِ وضعِ جنوں سے نہیں یہ امر بعید — بحر سے آگ تو صحراؤں سے پانی مانگے

ہائے اُس عاشقِ ناکام کی تقدیر کہ جو — تیرا پیغام رقیبوں کی زبانی مانگے

کاش وہ جلوۂ صد رنگ بہ آئینۂ ذوق — پھر وہی شدّتِ احساس جوانی مانگے

التماسِ غمِ دل ضبطِ الم کا پابند — اور درازیٔ شبِ ہجر کہانی مانگے

بھر آسودگیٔ مشغلۂ بربادی — نئی تعمیر نہ پھر عالمِ فانی مانگے

اس کا مقصدِ طلب مے کے سوا کچھ بھی نہیں — آگ مانگے کوئی میخوار کہ پانی مانگے

تُف وہ مجبور جوانی کہ جو ہو طالبِ حسن — حیف وہ حسن جو فرسودہ جوانی مانگے

کیا کروں جب کوئی موضوعِ سخن بھر نمود — میری مجبوریٔ آشفتہ بیانی مانگے

ہم تو اس بات کو باور نہیں کر سکتے بشر — مالکِ ملکِ سخن تاجِ کیانی مانگے

۱۹۶۰ء

(۲۱)

ہماری راہ میں سو بار آئے — تھرکتے ناچتے یادوں کے سائے

وہ مندر ہے کہ میخانہ کہ مسجد — دیئے کچھ دور پہ پھر ٹمٹمائے

صنم خانوں کی بربادی کا ماتم — نہ کرنے پائے ہم افسوس ہائے

سرِ میخانہ واعظ کے لئے آج — اٹھا یہ شور "حضرت آئے آئے"

مری آہوں کا حسرت ناک پہلو
شکایت کے دھوئیں میں دب جائے

خوشا وہ لذتِ دردِ جوانی
بڑھاپا جسکو ڈھونڈھے سے نہ پائے

وہ مے کیا ہوگی جسکو پی کے ساقی
کبھی ہچکی کبھی اُبکائی آئے

غرارے اور جمپر کی حسینہ
درازوں سے نہ پھر جھلکی دکھائے

بشوق آئینہ دیکھیں آپ لیکن
رُخِ مہتاب گوں شرما نہ جائے

غمِ منزل کے ماروں کے لئے آج
تھکن نے راہ میں بستر بچھائے

کہانی میری بھی غمگین تھی کیا
ثمر روئے بہت اپنے پرائے

۱۹۶۱ء

(۲۲)

جوانی آئی نئے ڈھنگ انکو آنے لگے
بدن چراتے چراتے وہ دل چرانے لگے

کبھی تو بھول کے میری طرف سے ہوگا گذر
سُنا ہے غیروں کے گھر اب وہ آنے جانے لگے

ہنسی ہنسی میں کہا تھا کہ بیوفا ہو تم
ذرا سی بات پہ اشک آنکھوں سے بہانے لگے

جناب شیخ تمنائے میکشی تھی بہت
لگا جو ساغرِ مے ہاتھ ہچکچانے لگے

حرم اداس ہے میخانے میں ہے سناٹا
تمہارے چاہنے والے جو ٹھکانے لگے

بہت ہے بات جو کرتے ہیں سیدھے منھ مجھ سے
یہ اجنبی مجھے پردیس میں یگانے لگے

ہمارے ذکر پہ ہنسنے میں لطف آتا تھا
تمہاری بات جو آئی تو تلملانے لگے

سنور سنور کے ہزاروں کو قتل کر ڈالا
جو اتفاق سے زلفوں کے ہاتھ شانے لگے

کہوں نہ کیسے وہ مست مئے جوانی ہیں
قدم بہکنے لگے پاؤں ڈگمگانے لگے

جو دل پسند غزل مل گئی ثمر اُن کو
نہ جانے سوچ کے کیا گھر میں اپنے گانے لگے

۱۹۶۲ء

(۲۳)

ہم جو بھوکے ہیں تو پتھر ہیں شکم پہ باندھے
تم کو کیا غم ہے کہ سینے پہ ہو پتھر باندھے

دونوں کاندھوں پہ ہیں ریشم سی لٹیں آویزاں
آہ ہوئے دل کو ہو تاروں سے مکرّر باندھے

طور کی برق کا عنوان ترا آنا ٹھہرا
پھر نیا کوئی سماں حسن کا منظر باندھے

دل کو کس طرح بچاؤ گے بتاؤ تو! اگر
کوئی جادو نگہِ چشمِ ستمگر باندھے

ان کے دو ابرووں میں فرق سرِ مو نہ ملا
جیسے شاعر نے ہوں دو مصرعے برابر باندھے

۱۹۶۲ء

(۲۴)

یہ خطا کر کے ہم اے محفلِ یار آئے ہیں
چلتے چلتے غمِ دوراں کو پکار آئے ہیں

رسن و دار کو کرتے ہوئے پیار آئے ہیں
بانکپن یہ ہے کہ یوں تا بہ مزار آئے ہیں

لیکے دیوانے گریبانوں کے تار آئے ہیں
دشت میں جانِ بہار آئنے ہار آئے ہیں

خوگرِ طعنِ رقیباں ہیں ترے دیوانے
یہ تری بزمِ طرب میں کئی بار آئے ہیں

آپکے تیرِ کرم کے ہیں نرالے کرتوت
آئیے دیکھئے کچھ سینہ فگار آئے ہیں

اس تصور سے میں کانپ اٹھتا ہوں پیشِ داور
آپ شرمائے ہوئے روزِ شمار آئے ہیں

فرشِ سبزہ پہ کوئی ساغرِ گل رکھ دیتا!
دشت میں آج سفیرانِ بہار آئے ہیں

درِ میخانہ پہ ساقی بہ تقاضائے طلب
پردۂ شب میں کچھ اربابِ خمار آئے ہیں

حرم و دیر سے میخانے کی چھت پر سرِ شام
اے بتِ سنگ ملامت کئی بار آئے ہیں

۱۹۶۲ء

(۲۵)

تضمین بر غزل مرزا غالب مرحوم

کیونکر کہوں میں تجھ سے کہ کیا مانگ؟ کیا نہ مانگ
زخمِ دل و جگر کی خدارا دوا نہ مانگ

غم ناشناس قیمتِ حسنِ وفا نہ مانگ
"گر تجھکو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ"
"یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ"

گذری ہوئی حیات کا آیا دیا نہ یاد — نہوں گزشتہ آرزوؤں کا ہے انتشار یاد
افسانہ غم کا آئے نہ کیوں بار بار یاد — "آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد"
"مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ"

ایک شعر

مدعا ہمدم ملا ہمکو رہِ اسرار سے — دل سرور آمادہ ہو گا آمدِ دلدار سے
(صنعتِ مہملہ)

فردیات

وصل کے بعد تکلف یہ تقاضائے حیا — اور بھی شوقِ ملاقات بڑھا دیتا ہے

حرم کے پاس زمینیں کئی ہیں افتادہ — جو تم کہو تو یہیں بتکدہ بنا ڈالیں

لفظ کو اصلِ حقیقت سے جدا رکھا ہے — ضبط کا نام زمانے نے وفا رکھا ہے

کوئی شکوہ نہ شکایت تھی لبوں پر دمِ قتل — ہم نے بس اتنا کہا آپ یہ کیا کرتے ہیں

یارب میں کدھر جاؤں کہ پہلو میں ہے کعبہ — اور منزلِ جاناں بھی بہت دور نہیں ہے

پڑے ہیں رہروانِ منزلِ مقصود الجھن میں — کہ جتنے رہنما تھے جمع ہیں سب کوئے رہزن میں

نوعیتِ امراض کی تشخیص میں گم ہے
بیگانہ ابھی تک ہے طبیب اپنی نظر سے

سجع

فخرِ نوعِ بشری واقفِ ہر رازِ حسینؑ — آپ کی ذات پر اسلام کو ہے نازِ حسینؑ
قوم زندہ ہے فقط آپکی قربانی سے — زندگی قوم کی ہے آپ کا اعجازِ حسینؑ[1]

[1] حبیبِ بزرگ پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم (سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی)

قطعہ

(بحر رمل مخبون شانزدہ رکنی)

غزل عارض ولب، نوحۂ دنیا کی صدا قید اسیرِ بط تدبیر کے آہنگ میں ہے
زندگی ایک ہے ہر حلقۂ تقدیر کے انسان کی لیکن وہ نہاں خانۂ صد رنگ میں ہے
ان شواہد سے ہے ظاہر کہ پسِ پردۂ تخلیق و نظام حرکی ہے کوئی پنہاں یوں ہی
گل میں جسطرح سے خوشبو، تنِ خاکی میں ہے جان اور شرر سوختہ انجام رگِ سنگ میں ہے

۱۹۶۲ء

ہزل

نہ کچھ منصور بیٹا ہے نہ کچھ منصورہ بیٹی ہے
جو وہ مجنوں کا بیٹا ہے تو یہ لیلیٰ کی بیٹی ہے

کھلا ہم پر یہ دعوت میں کہ بیٹا ان پیرزادوں کا
خدائی کارخانے کی ہی چمڑے کی پیٹی ہے

حقوق ان ہیجڑوں کے آخر حکومت کیوں نہیں دیتی
کہ انکی بھی تو پنچایت ہے اور قائم کمیٹی ہے

مجھے برساتی نیتا لگ رہا ہے، کل جو ہیٹے پر
پھٹے دامن میں اس نے دولتِ شہرت سمیٹی ہے

کمر کس کر وہ لڑنے پر ہے آمادہ نہیں تو کیوں
کمر میں زلف بیٹی کی طرح اس نے لپیٹی ہے

منسٹر ہوں گے مدعو شہر کے حکام بھی ہوں گے
سنا ہے مس غرض رانی کے گھر یہ آگئی ٹی ہے

خیالِ خاطرِ دشمن سے کہتا ہی پڑا مجھکو
بڑی دبلی وہ ہے میں مانتا ہوں پھر بھی ڈیٹی ہے

مبارک ہو تمہیں بنیوں کا پہلو خوب گرماؤ
تمہاری جا پہ میری مفلسی بستر پہ لیٹی ہے

ثمر کی شاعری کی ہیروئن اب بھی ہے بی لیلیٰ
پرانی قلم ہے اس واسطے یہ ہاف ریٹی ہے

۱۹۶۱ء

طنز و مزاح

(۱)

ایک ہپّی نے یہ ہپّی سے کہا تم برہنہ ہو گے پہلے یا کہ ہم

وہ یہ بولا فیصلہ کر لیں گے پھر پہلے گانجا پی لیں ہم اک اک چلم

پی کے گانجا ہو گئے انٹا غفیل اور ہوئے اک دوسرے میں خوب ضم

پھر بنامِ حُسنِ فطرت بن گئے بے حیائی کا دو رنگا البلم

ریل کے ڈبے میں پھر بننے لگا حُسن کا جادہ محبّت کا جحم

شاہدِ جذبات کا قتلِ صریح

دیکھتے ہی رہ گئے حسرت سے ہم

۱۹۷۲ء

(۲)

رو کے محبوبہ سے بولا عاشقِ خانہ خراب اے اسیرِ حُسنِ رعنا اے گرفتارِ شباب

پا کے موقع تو حیا کے قید خانے سے نکل تیری صحبت سے ہو تجھ پہ مرنیوالا فیضیاب

پتھروں سے کھیلے دیوانہ کہ غاروں میں گھُسے شوق سے جب چاہے پی لے ہونٹوں کی صہبائے ناب

اُٹھ گیا سو سائٹی سے جب کہ پردے کا رواج ہے خلافِ وضع پھر پابندئ رسمِ حجاب

اے چراغِ خانہ بن جا شمعِ محفل تا کہ پھر ہر حقیقت دیکھ لے آنکھوں سے اپنی بے نقاب

لوگ تیرے حُسن کو دیں ووٹ تیرے نام پہ کھائیں ہم بھی شوق سے ہر دن پراٹھا اور کباب

ہر کلب ہر رہگذر ہر بزم میں ہر پارک میں صورت سایہ رہیں ہر جا پہ تیرے ہم رکاب

بالغِ ذوق ترقی امر کوئی بھی نہ ہو ہو ہماری زندگی ہمراہ تیرے کامیاب

مندرج ہو نام تیرا صیغۂ ترتیب میں جب ہم اپنی شاعری کی کوئی بھی چھاپیں کتاب

۱۹۷۰ء

نام تیرا بیچ کر کچھ تو کما کھائیں گے ہم
تیرے زیرِ سایہ ہی مشہور ہو جائیں گے ہم

ریختی

نوج! باجی، میں نہ جاؤں کبھی مردار کے پاس
بیٹھی رہتی ہے وہ حرّافہ گھسی یار کے پاس

اٹھی پیشاب کو جب رات تو اَمّی دیکھا
ایک سایہ سا سرکتا ہوا دیوار کے پاس

مجھ سے کیوں روٹھے ہو تم کان بھرے ہیں کس نے
میں کہاں، جاتی ہوں کب، کس موئے فی النّار کے پاس

ان سے کہیو، بی بلاقن جو کہیں مل جائیں
ملنا چاہو، تو ملو رات کو چھتنار کے پاس

کنواری نندوں کی نظر کو ہے لگا شک کا روگ
اپنا پاجامہ نہ رکھئے مری شلوار کے پاس

جاتی رہتی ہوں انھیں اپنا بنانے کے لئے
کبھی رمّال کے پاس اور کبھی جفّار کے پاس

تجربے ایسے ہوئے مجھکو ثمر صاحب سے
میں پھٹکنے کی ہوا اب تو نہیں پیار کے پاس،

۱۹۸۰ء

مثنویات

مثنوی شمعِ کشتہ

زمانے کا بدلا ہوا ہے مزاج
جنم لے چکا ہے نیا اک سماج

شہنشاہیت اب بُری چیز ہے
حکومت رعایا ہی کی چیز ہے

حکومت کا لیکن نہ بدلا مزاج
جو تھا کل طریقہ وہ ہے اس کا آج

حکومت بھی اپنی ہے قانون بھی
بڑی زود اثر ہے یہ معجون بھی

ہمارے ہی قبضے میں ہے گو وطن
بدیسی ہی ہے سلطنت کا چلن

حدودِ وطن اشتراکِ ملل
یہ تعریفِ قوم آج تھی نہ کل

نہ تہذیب سے اور نہ کلچر سے کام
ہے یک رنگیٔ رسمِ ملت حرام

یہ تہذیب ہے کارفرما جو آج
ہے ناآشنائے سکونِ مزاج

ہے شامل یہ ہر پارۂ وقت میں
یہ پلتی ہے گہوارۂ وقت میں

اسی سے ہے قوم و وطن کی بقا
اسی سے ہے حسنِ چمن کی بقا

ہلاکِ ستمگاریٔ روز و شب
سمِ دیر اثر اس کے حق میں غضب

وہ کلچر جنم خود سے لیتا ہے جو
بڑا خوش طبیعت بڑا صاف گو

روابط کا ساز اس کا سرمایہ ہے
فریدوں یہ ہے اور وہ پرمایہ ہے

مرنجاں مرنج اسکی طبع لطیف
تعصب ہے اس کی نظر میں کثیف

بڑا صاحبِ دیدۂ انتخاب
شعور اس کا عالم میں ہے لاجواب

خود اسباب جو خود ہی اسباب زا
خود اسباب رس از برائے بقا

مدد غیر کی وجہ تذلیل ہے
یہ احساسِ نازک کی اک جھیل ہے

عجب طرح کا اس کا ہے لین دین
کبھی ہے یہ اکبر کبھی تان سین

بڑھا داہنا ہاتھ جب وقت کا
لیا اس نے چپکے سے جو کچھ ملا

خبر دستِ چپ کو نہ اسکی ہوئی
یہ داد و ستد بھی ہے کتنی بھلی

تکلف، تحکم، تنفر سے بیر
یہ سب چیزیں ہیں اصل میں اسکی غیر

یہ کلچر بھی میراثِ اجداد ہے
گذشتہ دنوں کی حسیں یاد ہے

تحفظ کا خواہاں تحفظ طلب
خود اپنا محافظ یہ ہے روز و شب

یہ کلچر ہے زائیدۂ عشق و میل
خصائص ہیں اس کے لکھے حسبِ ذیل

یہ کلچر ہے مجموعۂ اتفاق
رسوم مسلسل کا تزئین و فاق

کشادہ دل و نیک و نازک مزاج
شرافت کا فرقِ مروّت پہ تاج

کبھی گم یہ تہذیب کے شہر میں
کبھی دُرِّ تہذیب اسی نہر میں

پسند اسکو ہے اتحّاد ذوات
کہ ہیں اس میں پوشیدہ لاکھوں صفات

یہ خود اپنا مصلح بقدر پسند
بیک وقت صیّاد و صید و کمند

ہماری پسند اسکو ہے ناگوار
جو ہم چاہیں وہ طبع نازک پہ بار

یہ زاہد پرانا گنہ گار ہے
خود اپنی طبیعت کا مختار ہے

سمجھ میں جو آتا ہے کرتا ہے یہ
ہزاروں طرح سے سنورتا ہے یہ

یہ معشوق تہذیب کے سر کا تاج
لقب اس نے پایا ہے شاہی مزاج

بدلتا ہے یہ اپنے دستور آپ
مسائل سے اس کے رہیں دور آپ

سن اے ناشناسِ مزا میرِ قوم
ہے ساتھ تمدن سے تہذیبِ قوم

تمدن ہے کیا ایک طرزِ حیات
تمدن سے ہے رونق کائنات

تمدن ہے قانونِ اخلاق بھی
تمدن برائی کا مشتاق بھی

مگر جس کو کہئے تمدن کی روح
چمن زار آدم کے گلشن کی روح

وہ ہے اک تصوّر بلند آستاں
لہو کی طرح جسم و دل میں رواں

مفادِ بشر یا معادِ بشر
بنامِ دگر اعتقادِ بشر

تمدن سے روشن بشر کی جبیں
تمدن نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں

اسی پہ تدیّن کی بنیاد ہے
جہانِ فروعات آباد ہے

یہ رسمِ زمانہ کی اک داستاں
یہ انسانیت کی ہے روح رواں

تمدن ہے اک نقطۂ اعتدال
زوال اس کا ملّت کا ہے خود زوال

تمدن سے ملّت کی قائم حیات
تمدن سے زندہ ہے ملّت کی ذات

تمدن غمِ زندگی کی بہار
تمدن علاجِ غمِ روزگار

رقم قصّہ دردِ عشرت کروں
کہو تو میں اسکی وضاحت کروں

کبھی جس تمدن کی تہذیب کا
حدی خواں طوائف کا کوٹھا بھی تھا

زر و مال پر جسکی بنیاد تھی
جو بندوں کی عالم میں ایجاد تھی

بہ اندازِ موسیقیؔ و شاعری
جہاں جوڑے جذبات میں لہر تھی

جہاں بے حقیقت عذاب و ثواب
جہاں پر عبادت تھا ذکرِ شراب

وہ تعویذ عفّت بندھا ران میں
جوانی تُلی زر کی میزان میں

وہ بکتے ہوئے جسم بازار میں
جو رہتے تھے دستِ خریدار میں

جو پلتے تھے باضابطہ روز و شب
نہیں عیب تھا بیچنا جن کا جب

خریدار تاجر کو پیارا بھی تھا
خوشی کا تھا سودا گوارا بھی تھا

بد اخلاقیوں کے وہ اڈّے بتمام
جو قائم تھے تا حدِ بالائے بام

جہاں جمع ہوتے تھے خورد و کلاں
جہاں پر برابر تھے پیر و جواں

خباثت کے گڈھے خباثت کے ڈھیر
جہاں سونے چاندی کا تھا ہیر پھیر

جہاں فن بہر حال پلتا رہا
جہاں ساز بھی گیت اُگلتا رہا

جہاں دلکشی کی ادائیں بھی تھیں
جہاں گھنگھروؤں کی صدائیں بھی تھیں

بہلتا تھا دل چشمِ دلدار سے
جہاں رس ٹپکتا تھا تلوار سے

جہاں طرزِ آرائشِ حُسن کا
مہیّا تھا سامان ہر دن نیا

جہاں آنکھوں میں تھا بجائے حیا
محبّت کا جادو ستم آشنا

جہاں عید دن رات شبرات تھی
جہاں عشرتِ دل کی برسات تھی

جہاں نفسِ امّارہ ہی کا تھا راج
جہاں قشقہ تھا زیبِ پائے جمال
کھنکتے ہوئے پائلوں کی ترنگ
بہاگ اور ٹھمری کہیں بھیرویں
وہ بزمِ طرب محفلِ حُسنِ یار
وہ حُسنِ جواں سائگی بام پر
وہ بالضدِ علاجِ غمِ روزگار
رئیسوں کے جیب گھربار وہ
وہ مفلس کی فردوسِ گوشِ و نظر
شرافت بھی تھی اک حدِ امتیاز
غمِ روزگار اور غمِ عشق کا
کتابِ بدی کا وہ آخر ورق
جہاں منبع تھا دھرم نامی فساد
کھنکتے ہوئے جامِ توبہ شکن
زمینداروں کے خاتمے کی رفیق
وہ افسانۂ عہدِ ماضی ہے اب
وہ عشرتکدہ قلبِ برباد کا
جہاں کا جدا سب سے طرزِ عمل
چھپا چادرِ عمر میں وہ شباب
وہ بیلے کے گجرے وہ عطر سہاگ

جہاں تربیت پاتا تھا اک سماج
جہاں نقشِ سجدہ بھی تھا پائمال
جوانی میں ڈوبا ہوا انگ انگ
کہیں شیام کلیان ٹوڑی کہیں
وہ طبلہ وہ سارنگی اور وہ ستار
بگو الحذر، الحذر، الحذر
وہ دو زرخ بخلوت ارم درکنار
برستے ہوئے ابرِ زرتار وہ
لپکتی ہوئی ہر نگہہ بام پر
جہاں بابِ اخلاق رہتا تھا باز
جہاں عارضی اک شفا خانہ تھا
بہو بیٹیوں کے لئے اک سبق
جہاں ہندو مسلم میں تھا اتّحاد
وہ یادہ پرستوں کا دیوانہ پن
وہ سرمایہ داری کی نہرِ عمیق
فقط ایک خوابِ تراضی ہے اب
نیا مشغلہ طبعِ ناشاد کا
رقابت تعصب کی نعم البدل
طلوع اک گگن پہ وہ دو آفتاب
وہ بھڑکی ہوئی حُسنِ عارض کی آگ

وہ صبح بنارس اودھ کی وہ شام
وہ بجلی کی آغوش میں صحن و بام

وہ بدکاریوں کی کھلی منڈیاں
وہ کوٹھے کے زندان میں رنڈیاں

شب زندگی کی سحر ہو گئی
کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو گئی

بجھی شمع محفل بجشن تمام
خوشی کا جہاں سے ہوا اختتام

زمانہ نگاہوں میں اندھیر ہے
یہ سب قسمتِ عشق کا پھیر ہے

نہ محفل رہی اور نہ ساقی رہا
زبانوں پہ افسانہ باقی رہا

حسیں خواب تھا شب کا رقص و سرود
کہ تھا رشکِ ناہید جس کا وجود

وہ بزمِ نشاط آفریں کا شباب
فسانہ بگوش از پئے چشم خواب

کہو شمعِ کشتہ کے پروانگاں
اُن اڈّوں کی دہرائیں اب داستاں

انھیں بند کرنے سے کیا فائدہ
خباثت بکھرنے سے کیا فائدہ

زمانے نے ہم سے لیا انتقام
بداخلاقیوں کا ہے بس لب پہ نام

گھروں میں ہے گانے بجانے کی مشق
انھیں کی طرح دل لبھانے کی مشق

فضا کالجوں کی بھی مسموم ہے
کہ ان کی حقیقت بھی معلوم ہے

وہ کالج ہے فیشن کی آماجگاہ
جہاں سے برائی کی ملتی ہے راہ

قدم ڈگمگائیں تو بچنا محال
شرافت کا ہو راہ میں انتقال

وہ جذبات کی آگ بھڑکی ہوئی
جوانی کی بجلی وہ کڑکی ہوئی

وہ درس غنا ناچ کا وہ سبق[1]
کتابِ محبّت کا پہلا ورق

وہ فیشن پرستی وہ کالج کے ٹھاٹھ
وہ کلچر کی خاطر برائی کے پاٹھ

وہ اُبھرے ہوئے سینے نازک بدن
جوانی کے پیاسے کنوارے چمن

دلوں کو فقط پیار کی آرزو
لبوں کو ہے گفتار کی آرزو

[1] ہندی تلفظ - نوٹ :- (صدیق کرم خان بہادر) وحید الحسن مرحوم (سابق سکریٹری بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کی فرمائش پر)

نگاہوں کو تکمیل جلوہ پسند
پھڑکتا ہوا مرتعش بند بند

انھیں غیر جنسوں کی فکر و تلاش
ادھر نوجواں ہاتھوں پہ دل کی قاش

وہ دو بجلیوں کی بھڑکتی سی دھار
وہ آغاز الفت اشاروں میں پیار

حیا بے حیائی کا ہو گی ہدف
تکلف کہ ہونا ہی ہے برطرف

محبت جو کی ہے تو ڈرتے نہیں
رہِ عاشقی میں ٹھہرتے نہیں

کہاں اب ہے باقی بشر کا وقار
زن و مرد کا اُٹھ گیا اعتبار

۱۹۷۰ء

مثنوی نما۔ فریب منزل

ہمکو پتہ نہیں ہے جہاں کے رواج کا
ہم خواب دیکھتے ہیں ابھی رام راج کا

برہما، مہیش، وشنو، سرشٹی، مہی آکاس
مایا کا جال بُننے کو جب بُن چکے کپاس

متھ کر سمندر، وش کا پیالہ ہوا نصیب
یہ راہو کیتو کا بھی چمتکار ہے عجیب

زہرابۂ حیات ہے شنکر کی زندگی
اندر کی اور، اور ہے باہر کی زندگی

ہے فکرِ ناتواں پہ عنایت جوان کی
تعریف کیوں کریں نہ ہم ارجن کے بان کی

ساوتری کا پیار کبھی لکشمی کا دھن
یادن پتی و دیویوں کا اُدتیہ چلن

کرتے ہیں یاد ذہن کی لذت کے واسطے
اندھے ازل سے ہم ہیں بصیرت کے واسطے

سُنکر دو رتی کی کتھا جانکی کی بات
بہلاؤں کے سمجھ بجھاتے ہیں کرم پرات

یگ یگ پہ ستیہ، پیار کا دھرم آزماتے ہیں
گوکل کی گوپیوں کی کہانی سناتے ہیں

کرتے ہیں رات دن جو اہنسا کا پاٹھ یاد
گوتم کی روح ہم سے اسی واسطے ہے شاد

کھا کر طمانچہ دوسرا کرتے ہیں پیش گال
عیسائیوں کے بنتے ہیں ہم گاہ ہم خیال

اسلام کا اُصولِ مقدّس زباں پہ ہے
لیکن عمل کا بوجھ سرِ ناتواں پہ ہے

قول و عمل میں اپنے ہے اتنا بڑا تضاد
ہر قول صرف ہوتا ہے از بہرِ استناد

مقصد یہ ہے وکالتِ بیجا کی راہ سے
جنّت میں جائیں جراتِ عزمِ گناہ سے

رکھتے ہیں مہرِ پشت پناہی کے واسطے
پیدا ہوئے ہیں قول کی شاہی کے واسطے

نانک کے گیان دھیان کے ہم قدرداں ہیں
اس واسطے کہ گرنتھ کی رو سے مہان ہیں

چشتی، نظام الدین، شکر گنج کے اصول
ممکن نہیں کہ ہم کسی عالم میں جائیں بھول

بھگوان رام، کرشن کی لیلا کو دیکھ کر
خوش ہوتے ہیں تو کرتے ہیں جے کار ادھر ادھر

تُلسی، کبیر، سور کی چیتنیہ کی قسم
بھگتی کی ساکھ رکھتے ہیں بھگتی کا ہم بھرم

تقلید افلاطون و ارسطو کی کرتے ہیں
دم کارل مارکس، روسو کا دن رات بھرتے ہیں

ہم لاک، ہیوم، برکلے کے ہیں خاص خوشہ چیں
رکھتے ہیں آستانۂ مغرب پہ بھی جبیں

ہم جیمس، جوائس، آرنلڈ و ایلیٹ کے ساتھ
تنقید کی گلی میں چلیں گے ملا کے ہاتھ

ژاں پال سارتر سے فرائڈ سے لے کے علم
یونہی بناتے جائیں گے ہم زندگی کی قلم

آدرش کے پجاری، گدائے دتار ہیں
اقوال کے ہم ایسے ہی سرمایہ دار ہیں

ہیں ناسمجھ اُٹھاتے ہیں ہر راستے کا غم
ہم نچلے کیسے بیٹھیں کہ ٹکتے نہیں قدم

۱۹۶۳ء

واسوخت

واسوزِ غم سے آج لگی ہے بدن میں آگ
دامانِ ہوش و عقل کے ہے پیرہن میں آگ
داغِ جگر سے پھیلی ہے دل کے چمن میں آگ
بھرتی ہے رفتہ رفتہ ربابِ سخن میں آگ
لبریز ہو چکا ہے جو پیمانہ صبر کا
لکھنا پڑا ہے مجھکو بھی افسانہ جبر کا

۱۹۶۳ء

آرائشِ جمال کی وہ رات یاد ہے
مبہم سے التفات کی سوغات یاد ہے
گذری جو مجھ پہ اشکوں کی برسات یاد ہے
جو تیری رازدار ہے وہ بات یاد ہے
روٹھا جو میں تو گھر سے بُلانے کے واسطے
بھیجا کبھی کسی کو منا لانے کے واسطے

حُسنِ کرم کو سچ ہے، نہیں مطلقاً ثبات
یہ چلتی پھرتی چھاؤں کہیں دن، کہیں پہ رات
گہوارۂ الم ہے مری دُکھ بھری حیات
یہ حدِ ستم کی، غیروں پہ ہے چشم التفات
آغوشِ آرزو مری اب تک کشادہ ہے
اے ننگِ حسن بول ترا کیا ارادہ ہے

آنکھوں میں یہ گلاب سے عارض ہیں بے وقار
خارِ نظر ہیں اب ترے گیسوئے تابدار
جب بے وفا ہو حُسن تو کیا عشق کی بہار
الفت کا بند کرنا پڑا مجھکو کاروبار
تو کیا بدل گئی کہ طبیعت بدل گئی
المختصر نگاہ کی فطرت بدل گئی

احساس کے بدن پہ لگے ہیں وہ تیر آہ
پابندیٔ وفا کو سمجھنا پڑا گناہ
کم ظرفوں سے شریفوں کا ممکن نہیں نباہ
تیری روش بدل چکی بدلوں گا میں بھی راہ
اب ہوٹلوں میں بیٹھوں گا لالہ رُخوں کے ساتھ
گھوموں گا پارکوں میں ملا کر کسی سے ہاتھ

بہتر ملیں گی تجھ سے، بنوں بے وفا اگر
آئیں ہزاروں حسن کی ملکائیں میرے گھر
کم سن، کنواری، فتنۂ دوراں، فسونِ نظر
گرمیٔ آرزو کی ستائی عرق میں تر
آسودگیٔ ذوقِ جوانی کے نام پر
چومیں گی میرے پاؤں کو ہر ایک گام پر

ہر گوشۂ سرورِ مطلا میں، بے وفا!
بازارِ دل، دیارِ تمنا میں، بے وفا!
نو خیز خواہشات کی دنیا میں، بے وفا!
ہوٹل میں، پارکوں میں، سنیما میں، بے وفا!

تیری نظر کے سامنے کھل کھیل جاؤں گا
طے کر لیا ہے ہنس کے تجھے میں رلاؤں گا

قطعات تاریخ وفات

مولانا کلب حسین مرحوم طاب ثراہ مجتہد لکھنؤ

چراغِ خانۂ غفرانمآب نور مبیں
جناب مولوی کلب حسین عالم دیں

تھے آپ حلقۂ اہل کمال میں ممتاز
جڑا تھا یا کہ انگوٹھی یہ کوئی عمدہ نگیں

جناب مجتہد العصر مفتئ اسلام
رئیس مملکت دیں بحکم مہدئ دیں

جو آسمان ہدایت کا مہر روشن تھا
ہزار حیف کہ اسکی ضیا ہے زیر زمیں

ہمارے ساتھ زمانہ ہے سوگوار تمام
دلاسا دیں کسے اور کس کے دلکو دیں تسکیں

خیالِ مصرعۂ تاریخِ مرگ آیا ہے
سنو بغور صدا دے رہا ہے قلب حزیں

جھکا کے سر قدم مجتہد پہ بولی اجل
جناب قبلہ و کعبہ مقیم خلد بریں

۱۳۸۲ + ۱ سنہ ھ = سنہ ۱۳۸۳ ھ (لتعمیہ)

والد محترم ریاض الحسن مرحوم اعلی اللہ مقامہٗ

جہاں سے اٹھے جب ریاض الحسن
بنی شمع رہ الفت پنجتن

مقامات اعلیٰ خدا نے دئے
بہ فیضانِ عشقِ حسین و حسن

شمیم نے جو کی فکر تاریخ مرگ
کہا گوشِ دل میں یہ رضوان نے
شرف وہ ملا سال رحلت انھیں

ملا قطعہ اک جس میں ہیں زر دو سخن
کہ "آئے جناں میں ریاض الحسن"
بہ آمد ہوا عیسوی جس سے سن

۵۸۰ + ۱۳۸۵ = ۱۹۶۵ء

محترم علی عباس خاں مرحوم پدر بزرگوار ظفر الحسن خاں صاحب و نجم الحسن خاں صاحب نصاب ۱۸ ٹولہ اکولہن۔ الہ آباد

جہاں کی بے ثباتی کا فسانہ یوں سناتے ہیں
سوئے جنت علی عباس اب دنیا سے جاتے ہیں
نمازی۔ نیک طینت۔ عاشقِ سبطِ نبیؐ۔ مومن
انھیں کے غم میں اہلِ خانداں آنسو بہاتے ہیں
شمیم ہاتف کی آتی ہے ندا بہر سنِ رحلت
دلِ قصرِ بہشتی میں علی عباس آتے ہیں

سنہ ۱۹۶۰ء

عزیز دوست ڈاکٹر محمد حماد فاروقی مرحوم بار ایٹ لا و سابق ممبر پبلک سروس کمیشن یو۔ پی

زندگی موت کو دیتی ہے خراج
ہے یہی عالمِ فانی کا رواج
دل پہ ہے شاق فراقِ حماد
کون جانے جو مرا حال ہے آج
سن ہجری میں ہے لکھنی تاریخ
مجھکو دینا ہے عقیدت کا خراج
بس یہ ہے مصرعۂ تاریخ وفات
حیف حماد سے چھوٹے شمیم آج

سنہ ۱۳۸۹ھ

محب محترم احتشام حسین مرحوم سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

بہر طرح جو حسینی تھا احتشام حسین
نہیں وہ ہم میں ہے اب خادم زہیر قلین
اداس اداس ہے شہر سخن دیار ادب
غم فراق اسی کا ہے آج باعث بین

خیال مصرعۂ تاریخ میں تھا سرگرداں
یہ فکر وہ تھی کہ ملتا نہ تھا دماغ کو چین
ثمر یہ آئی دلِ یاس سے صدا کہ لکھو
حدودِ قبر میں ہے سید احتشام حسین

۱ + ۱۳۹۱ = ۱۳۹۲ سنہ ھ

ماموں محمد الیاس مرحوم پردھان۔ قصبہ ہلور۔ بستی

پیرہن زیست کا اترا جو تنِ خاکی سے
موت نے پیش کیا ہستیٔ باقی کا لباس
لکھ ثمر مصرعۂ تاریخِ اجل ہجری میں
آتے ہیں مسکنِ جنّت میں محمد الیاس

۱۳۹۴ سنہ ھ

چیستاں (در صنعت توشیح)

سخت خو، گرم مزاج آبلہ پا تیز قدم
واقفِ رازِ عمل نکتۂ جہاں کا محرم
راہی ایسا کہ نہ تھکتا نہ بدلتا ہے راہ
جاگتا ہی اسے پاؤ گے ہو کوئی عالم

سنہ ۱۹۶۷ء

یادگارِ امیر خسرو رح

۱۔ ڈھکوسلا:۔ ایک پرانی کھڑکی بیچ۔ سگرٹ جلی دکھات۔ بڑل رے لت کے مارے اُدھر۔ پی لوں یا شرماؤں۔ (سنہ ۱۹۶۵ء)

۲۔ اَنمِل:۔ شبدوں سے گُڑیا بنائی۔ سورج دیا جلائے۔ ٹاٹ اکیلا دیکھ دیکھ۔ پاپی من للچائے۔ (سنہ ۱۹۶۵ء)

۳۔ مکرنی:۔ گیا سنیہا مورے سنگ
پی کر یا نکا رات کو بھنگ
لوٹائے کر دُمری پچھڑ رہی
اسے سکھی ساجن۔ نا سکھی موری
(سنہ ۱۹۶۵ء)

۴۔ دو سخنے:۔ کوٹھا کیوں نہ ٹِکا ——— پٹّا نہ تھا
سودا کیوں نہ بِکا ——— بٹّا نہ تھا
(سنہ ۱۹۶۵ء)

سلام

مجرئی یہ ہے فروغِ دولتِ شانِ حسینؑ
آسمانوں سے کہیں اونچا ہے ایوانِ حسینؑ

اب یہ عالم ہے کہ سب دانشورانِ کائنات
لکھتے ہیں تاریخِ انسانی بعنوانِ حسینؑ

تاج رکھ کر سر پہ بندہ بن نہیں سکتا خدا
زندہ و پائندہ ہے یہ عام اعلانِ حسینؑ

بٹ رہا ہے آجتک میخانۂ تقدیس سے
بادۂ حریتِ آدم بہ فیضانِ حسینؑ

ہے بقیدِ بندگی آزادیٔ فکر و ضمیر
اہلِ ایماں کو مبارک ہو یہ فرمانِ حسینؑ

سر بسجدہ ہو کے سر کٹوا دیا شبیرؑ نے
رہ گیا اسلام کی گردن پر احسانِ حسینؑ

قلبِ زینبؑ، طینتِ عباسؑ، کیفِ عشقِ حرؓ
ہوں یہ ساماں تب کہیں ممکن ہے عرفانِ حسینؑ

زندگی بخشی ہے سرورؑ نے ہر اک انسان کو
کائناتِ آدمِ خاکی ہے قربانِ حسینؑ

مضطرب ہے کس قدر شیرازہ بندِ دینِ حق
آئینہ دار اسکی ہے زلفِ پریشانِ حسینؑ

بعد محشر جنت و کوثر کی حاجت ہی نہ تھی
خلق دنیا میں نہ ہوتے گر محبانِ حسینؑ

زائرینِ روضۂ سرور مبارک ہو تمہیں
جنت اہلِ ولا ہے زیرِ دامانِ حسینؑ

تو امیرِ کشورِ شعر و سخن ہے بالیقیں
ہو مبارک تجھکو یہ منصب ثناخوانِ حسینؑ

دارِ دنیا۔ قبر و برزخ اور محشر میں قمرؔ
کر دعا اللہ سے تجھ پر ہو احسانِ حسینؑ

۱۹۸۰ء

رباعی

عالم میں ہے اللہ کی وحدت باقی
شبیرؑ سے ہے دینِ رسالت باقی
تا روزِ قیامت قمرؔ انعام ہے یہ
ہے نسلِ حسینی میں امامت باقی

۱۹۸۰ء

مرثیہ

'پردۂ قصر عروس شب مہتاب اُٹھا'

در حال حضرت عباس علیہ السلام

پردۂ قصر عروسِ شبِ مہتاب اُٹھا
بحرِ انوار میں تسلیم کو گرداب اُٹھا
غُل یہ گلشن میں ہوا نور کا سیلاب اُٹھا
آنکھیں ملتا ہوا پھر سبزۂ کم خواب اُٹھا
غنچے کھِل کھِل کے اذانِ سحری دینے لگے
پھول ہنس ہنس کے نشانِ سحری دینے لگے

یوں نظر آنے لگی قدرتِ ربِّ قادر
حکمِ کوثر کا ملا جب کہ وضو کی خاطر
جامِ آب آئی لئے شبنم تہہ بالآخر
جم گئیں باغ میں پیڑوں کی صفیں متواتر
اہلِ گلشن ہوئے آمادہ جو طاعت کے لئے
گُل گلزارِ نبیؐ آیا امامت کے لئے

باغ میں سیر و سیاحت کے لئے آئی ہوا
حمد آہنگ۔ عنادل کا ترانہ گونجا
کلیاں چٹکیں تو ہوئی بیدار درودوں کی صدا
کھِل اُٹھے پھول تو گلزارِ عبادت مہکا
فرض نے پھیرا جو رُخ قادرِ مطلق کی طرف
متوجہ ہوئے سب تذکرۂ حق کی طرف

ملگجی صبح عیاں یوں ہوئی مہتاب کے بعد
سرمہ سا آنکھ کھلے جیسے کہیں خواب کے بعد
غول حوروں کا چلا خلد سے آداب کے بعد
خدمتِ شاہ میں کی عرض یہ القاب کے بعد
واری یہ بانوئے جنّت کی کنیزیں مولا
لائی ہیں نذر کو فردوس کی چیزیں مولا

یہ قبا سُندُسی - استبرقی جامہ یہ ہے　　اطلسی خلد معلیٰ کا عمامہ یہ ہے
رب کی مرضی جو خریدی ہے تو نامہ یہ ہے　　یہ قلمدان مشیت کا ہے خامہ یہ ہے

حق کا اعلان یہ ہے خلد کے سردار ہیں آپ
جسکو جو چاہیں دیں کونین کے مختار ہیں آپ

حق پرست اور نمازی تھے وفادارِ حسینؑ　　فرشِ طاعت پہ کھڑے ہو گئے انصارِ حسینؑ
شہ امام اور تھے ماموم یہ غمخوارِ حسینؑ　　ناشرِ دینِ نبیؐ بن گیا کردارِ حسینؑ

بصد اخلاص عمل بہرِ دعا ہاتھ اٹھے
شہ کے انصار مصلّے سے سب اک ساتھ اٹھے

باہم اک دوسرے سے مل کے گلے اہلِ وفا　　کرتے جاتے تھے وصایا بہ تقاضائے ولا
یوں جتاتے تھے وہ سب حق رسول دوسرا　　دیکھتے دیکھتے میدان کا نقشہ بدلا

شہ مصلّے سے اُٹھے جلوۂ خورشید سے قبل
تیر اِدھر آنے لگے جنگ کی تمہید سے قبل

ہوئے آمادۂ شر دشمنِ اخلاق و ادب　　تیر برسانے لگا لشکرِ انعام طلب
متعجب ہوئے اس فعل پہ سلطانِ عرب　　اہلِ حق سونت کے شمشیرِ دو دم آ گئے تب

بولے شہ ہے ابھی قرضِ بشریت باقی
دوستو ٹھہرو کہ ہے آخری حجت باقی

اُمتِ جد کا تھا فرزندِ پیمبرؐ کو پاس　　ناقہ منگوایا شہ دیں نے، تو لائے عباسؑ
جلوہ گر اس پہ ہوئے بادشہ نور اساس　　بسر رحمتِ حق پہ اترا انداز تھی پیاس

موجیں کوثر کی تھیں بیتاب اُبھرنے کے لئے
مضطرب فاطمہؑ کا لال تھا مرنے کے لئے

پشت ناقہ پہ بصد حسنِ رسولِ دوسرا
وعظ کے واسطے میدان میں آئے مولا
فوجِ دشمن کو مخاطب بہ ایں انداز کیا
کیوں مرے قتل پہ آمادہ ہو بے جرم و خطا
ہوں مسلمان بھی احمدؐ کا نواسا بھی ہوں
میں بلایا ہوا مہمان ہوں پیاسا بھی ہوں

دلِ دشمن میں تو گھر کر گئی شبیرؑ کی بات
سامنے آئی مگر منصب و جاگیر کی بات
باہم اعدا میں ہوئی قتل کی تدبیر کی بات
ٹل سکی ہے نہ ٹلے گی کبھی تقدیر کی بات
پورا جو فوجِ شقاوت کا تھا ارمان ہوا
جنگ کا متفقہ طور پہ اعلان ہوا

پسرِ سعدِ لعیں بولا جو بیعت کر لیں
غیر مشروط اگر آپ اطاعت کر لیں
حاکمِ شام کی تسلیم خلافت کر لیں
قتل سے بچنے کی آسان سی صورت کر لیں
آپ کو لے کے چلیں عزت و اکرام کے ساتھ
اور رخصت کرے سلطان بھی انعام کے ساتھ

سُن کے دشمن کی یہ تقریرِ ضلالت آمیز
دشت میں ہو گئے لبہائے شہِ دیں گُل ریز
بصد افسوس کہا ہے یہ سخن عبرت خیز
مجھ سے بیعت طلبی لشکرِ فتنہ انگیز!
نہ تو دولت نہ تو لشکر نہ وغا کے آگے
سر یہ جُھکتا ہے فقط ربِّ علا کے آگے

میری بیعت ہے حسنؑ ابنِ علیؑ کی بیعت
میری بیعت ہے محمدؐ کے وصیؑ کی بیعت
میری بیعت ہے رسولِ عربیؐ کی بیعت
میری بیعت ہے خدائے ازلی کی بیعت
مجھ سے بیعت طلبی ظلم بھی عدوان بھی ہے
مجھ سے بیعت طلبی کفر کا اعلان بھی ہے

پھول سے خار کی بیعت طلبی کیا معنی
خلد سے نار کی بیعت طلبی کیا معنی
دیں سے کفار کی بیعت طلبی کیا معنی
جیت سے ہار کی بیعت طلبی کیا معنی

سر بلند رہ حق دار چڑھا کرتے ہیں
نوک نیزہ پہ وہ قرآن پڑھا کرتے ہیں

جو کوئی بیخ کن لات و ہبل ہوتا ہے
وارث فاتح صفین و جمل ہوتا ہے
وجہ آزادیٔ اقوام و ملل ہوتا ہے
آج مفتوح تو فاتح وہی کل ہوتا ہے

سرنگوں صاحب اکلیل و سریر آتے ہیں
اس کے روضہ پہ گدا بن کے امیر آتے ہیں

سر کٹا دے گا لٹا دے گا یہ اپنا گھر بار
نہیں بیعت کے لئے سبط پیمبرؐ تیار
دل میں جو کچھ ہے نکالو وہ عداوت کا غبار
فدیۂ دین خدا ہوں گے عزیز و انصار

زندگی ہے نہ ہمیں راحت و آرام عزیز
بڑھ کے ہے اکبرؑ و عباسؑ سے اسلام عزیز

گفتگو ختم تو حجت کا بھی اتمام ہوا
فرض جو کار ہدایت تھا سر انجام ہوا
ستم و ظلم کا لبریز ادھر جام ہوا
مائل جنگ بن سعد سبک نام ہوا

طبل پہ چوٹ پڑی جب تو جلاجل چونکا
خیمہ میں ثانیٔ زہرؑا کا ادھر دل چونکا

شمر نے جب دیکھا کہ ممکن نہیں پیکار نہ ہو
نیزے رن میں نہ چلیں تیروں کی بوچھار نہ ہو
دو بدو تیغ کا اک دوسرے پہ وار نہ ہو
کیونکہ ایسے میں کوئی جنگ پہ تیار نہ ہو

مختصر فوج حسینی کی بھی تشکیل ہوئی
میمنہ - میسرہ و قلب کی تکمیل ہوئی

تب مقرر ہوئے عباسؑ علمدارِ حسینؑ — زور بازو کا بڑھا اور گھٹا بارِ حسینؑ
جمع یکجا ہوئے سب مونس و غمخوارِ حسینؑ — تہنیت کے لئے آگے بڑھے انصارِ حسینؑ
سب نے اک ساتھ کہا ابن علیؑ زندہ باد
نائب السلطنت سبط نبیؐ زندہ باد (صلوٰۃ)

پہونچا عباس کے ہاتھوں میں جو سرور کا علم — ناز کرنے لگا اسلام کے لشکر کا علم
پا گیا عظمتِ معراج پیمبرؐ کا علم — اونچا عالم میں ہوا مذہب داور کا علم
ایسا بارعب زمانے سے تو کم اٹھتا ہے
بے علمدار کے اب تک یہ علم اٹھتا ہے

پایا فرزند نے منصب صدقہ عام ملے — ہم غلاموں کو بھی دربار سے انعام ملے
چاہئے ساقیٔ کوثر ہمیں جام ملے — ساغر بادۂ عرفاں سحر و شام ملے
شیخ آ آکے ستائے گا جو ہوش آئیگا
دیکھ کر ہمکو وہ سرمست چلا جائے گا

خشک ہوتی ہے زباں اسکو روانی دیدے — صدقہ حضرت عباسؑ کا پانی دیدے
دے وہ بادہ جو مجھے زور جوانی دیدے — معجزہ سے یم اعجاز بیانی دیدے
گوشۂ ذہن سے مدحت کا سمندر اٹھے
جنبش لب سے نیا گھر لب کوثر اٹھے

دے وہ مے پیتے تھے جس مے کو رفیقانِ امام — جس کا پایا تھا حبیب ابن مظاہرؓ نے جام
جس کے رندوں میں بریرؓ اور رہے مسلمؓ کا نام — جس کے عادی تھے زہیرؓ و حرؓ و جونِ خوش کام
چاشنی جس میں شہادت کی بھری ہے ساقی
نشہ جس مے کا عروجِ بشری ہے ساقی

جس کے پینے سے مودت پہ نکھار آتا ہے	سچ یہ ہے جذبۂ نصرت پہ نکھار آتا ہے
ہر گھڑی ذوقِ رفاقت پہ نکھار آتا ہے	بعد مرنے کے شہادت پہ نکھار آتا ہے

جو کٹے جاتے ہیں اس مے کے طلبگاروں میں
کود پڑتے ہیں وہی تیروں میں تلواروں میں

تیر دشمن کے جو آنے لگے سوئے شبیرؑ	جنگ کا ہو گیا آغاز بصد ظلم کثیر
حملہ کرنے لگے ہر سمت سے ناری بے پیر	حکم سرور نے دیا غازیو! تولو شمشیر

ببر شیروں کی طرح شاہ کے یاور دوڑے
صفِ دشمن پہ یہ سب گھوڑے بڑھا کر دوڑے

منتشر ہو گئے اعدا پڑا گھمسان کا رن	تب کمیں گاہ سے آئی یہ صدائے دشمن
ایک سے ایک کی ہو جنگ یہی ہے احسن	یہ لڑائی کا دلیروں میں ہے آئین کہن

ہم قسم کھاتے ہیں نرغہ نہ کسی پہ ہوگا
اب سے اس طرح کا حملہ نہ کسی پہ ہوگا

سن کے فریادِ عدو لوٹے رفیقانِ شاہ	جمع پھر ہو گئی بھاگی ہوئی لاکھوں کی سپاہ
پہرہ داروں کی کڑی ہو گئی دریا پہ نگاہ	جاں بلب پیاس سے میدان میں تھی فوجِ الٰہ

دلِ غازی کو جو ہر لمحہ قلق ہوتا تھا
رُخِ عباسؑ غم و رنج سے فق ہوتا تھا

فاصلے وقت کے دامن میں سمائیں تو کہیں	لفظیں کچھ دائرہ فکر میں آئیں تو کہیں
آئینے چہرۂ احساس دکھائیں تو کہیں	دل ہمارا جو حق آگاہ بڑھائیں تو کہیں

پردے ان آنکھوں سے اُٹھے ہیں گرے ہیں سو بار
رمز و اسرار کے کوچے میں پھرے ہیں سو بار

اشجع النّاس اسدِ ضیغم داور یا سؔ
پنجۂ دستِ خدا۔ رن میں مظفر عباسؑ
ہاشمی چرخِ وفا کا مہِ انور عباسؑ
یعنی سقائے حرم عازم کوثر عباسؑ

صاحبِ پرچمِ فوجِ شہ مظلوم ہوئے
چند القاب یہ عباسؑ کے مرقوم ہوئے

قوتِ بازوئے شاہِ شہدا ہے عباسؑ
درسگاہِ عمل و عزم و وفا ہے عباسؑ
قہرِ آثارِ مشیت کی ادا ہے عباسؑ
اسدِ بیشۂ ضرغامِ خدا ہے عباسؑ

حرب و ضرب ایسی کہ حیدرؑ کا گماں ہوتا ہے
ہاتھ کٹنے پہ بھی جعفرؑ کا گماں ہوتا ہے

فدیۂ راہ خدا عاشقِ مظلوم ہے یہ
حشر تک نام علمدار سے موسوم ہے یہ
غمگسارِ شہ دیں بیکس و مغموم ہے یہ
صاف کہتا ہے یہ کردار کہ معصوم ہے یہ

عابد و زاہد اور ایمان کا پیکر یہ ہے
کہدوں میں مختصراً ثانیٔ حیدر یہ ہے

لفظِ بے معنی تھا ہمت جو نہ ہوتے عباسؑ
حرفِ بے صوت تھا جرأت جو نہ ہوتے عباسؑ
خوابِ مہمل تھا رفاقت جو نہ ہوتے عباسؑ
کیا وفا کی تھی ضمانت جو نہ ہوتے عباسؑ

دوستی اور محبت کو قضا آجاتی
یہ نہ ہوتے تو شجاعت کو قضا آجاتی

ہے کتابوں میں یہ تحریر کہ روزِ عاشور
فوجِ دشمن میں ہوئے جب شہ والا محصور
زندگی سے ہوا انصارِ حسینی کو نفور
قتل ہو ہو کے گئے خلد کی جانب وہ غیور

کوئی لشکر نہ رہا صاحبِ لشکر کے سوا
اور ناصر نہ رہا ثانیٔ حیدرؑ کے سوا

داغ اعزا کا اٹھائے ہوئے دل پہ مغموم
آئے عباسؑ جری نزدِ حسینؑ مظلوم
عرض کی شاہ سے یہ۔ بہرِ خدائے قیوم
بھیجئے مجھکو میانِ سپہِ شام و روم
جی کے میں کیا کروں جب قاسمؑ و اکبرؑ نہ رہے
چاہتا ہوں کہ مرے جسم پہ اب سر نہ رہے

کام جب آچکے انصارِ شہنشاہِ عرب
جان دیکر ہوئے فردوس نشیں سب کے سب
دلِ عباسؑ دلاور کو ہوا رنج و تعب
جوڑ کر ہاتھوں کو تب شہ سے ہوئے اذن طلب
شہ نے فرمایا کہ جاتے ہو تو جاؤ بھائی
دل مرا اپنی جدائی سے دکھاؤ بھائی

آبدیدہ ہوئے شہ اور کہا اچھا جاؤ
جاؤ اور اپنی شہادت کی خبر ہم کو سناؤ
قبل مرنے کے جو ممکن ہو تو پانی لاؤ
اک ذرا خیمے میں بہنوں سے بھی ملتے آؤ
ساتھ میں سوکھی ہوئی مشک سکینہؑ لے لو
اور دعائے حرمِ شاہ مدینہ لے لو

آئے خیمے میں جو عباس بہ اندوہ کثیر
خاک پہ بیٹھ گئے آکے وہ نزد ہمشیر
سر جھکا کر بصد افسوس یہی کی تقریر
اک گذارش ہے سنیں بنتِ شہ خیبر گیر
ابھی کچھ کہنے نہ پائے تھے۔ قیامت آئی
بولیں زینبؑ کہ نئی مجھ پہ مصیبت آئی

روکے زینبؑ یہ پکاری کہ اب آؤ بابا
وقت امداد ہے اعجاز دکھاؤ بابا
رحم تنہائیٔ شبیرؑ پہ کھاؤ بابا
اپنے فرزند کو مرنے سے بچاؤ بابا
چھوڑ کر آؤ نجف، کرب و بلا میں آؤ
اک ذرا دیر کو گنجِ شہدا میں آؤ

بنت حیدر نے کہا مجھکو خبر ہے بھائی — تم کو فردوس کا در پیش سفر ہے بھائی
سچ یہ ہے آج سے ویران یہ گھر ہے بھائی — یہ اجازت طلبی سخت مگر ہے بھائی
آپ اے بھائی اگر رخت سفر باندھیں گے
میرے بازو میں رسن بانیٔ شر باندھیں گے

ام کلثوم سے مل لو کہ ہے مجبور بہت — شہ سے محجوب غم و رنج سے ہے چور بہت
کوئی فدیہ نہیں رکھتی تو ہے رنجور بہت — پردۂ دل میں تمنائیں ہیں مستور بہت
کوئی اولاد جو ہوتی تو فدا کر دیتی
خون سے ساغر ایثار کو یہ بھر دیتی

سن کے تقریر بہن کی ہوا بھائی مغموم — آیا حیدر کا پسر جانب ام کلثوم
عرض کی آپ پہ ہے رنج و الم کا جو ہجوم — اے بہن خوب سبب اسکا ہے مجھکو معلوم
شہ پہ قربان مجھے کیجئے خورسند ہوں میں
چھوٹا بھائی ہوں تو ہم رتبۂ فرزند ہوں میں

خوش ہوئی سن کے یہ کلمات وہ زہرا سیرت — بخش دی بھائی کو خواہر نے متاع الفت
فتح کی دے کے دعا دیدیا اذن رخصت — دل بھر آیا بہ تقاضائے غم بشریت
پھر کہا رو کے خدا حافظ و ناصر بھائی
میرے مظلوم میرے پیاسے مسافر بھائی

جانب نہر جری مشک و علم لے کے بڑھا — جاہ جعفرؓ کا تو حمزہؓ کا حشم لیکے بڑھا
ساتھ میں اپنی وفاؤں کا بھرم لیکے بڑھا — گود میں پالے ہوئے بچوں کا غم لیکے بڑھا
غل ہوا پھر قصاص آج یداللہ آئے
تیغ تولے ہوئے وہ حیدر ذیجاہ آئے

یہ ہے تصویرِ علیؑ حسن و وجاہت دیکھو
ضوفگن ماتھے پہ ہے نقشِ عبادت دیکھو
حق پرستی کی ادا شان ولایت دیکھو
ضیغمِ حق نظر آتا ہے جلالت دیکھو
وہی تیور ہیں وہی طبع کی افتاد بھی ہے
اس کے بازو میں وہی زورِ خداداد بھی ہے

انگلیاں وہ ہیں کہ نیزے کی انی ناز کرے
وہ کلائی ہے کہ زورِ بدنی ناز کرے
ہاتھ کو دیکھ کے شمشیر زنی ناز کرے
سینہ وجسم پہ خود تہمتنی ناز کرے
حسنِ رفتار یہ ہے رن کی زمیں جھومتی ہے
پاؤں ایسے ہیں کہ ثابت قدمی چومتی ہے

قد بالا ہے کہ ہے سروِ ریاضِ حیدرؑ
حسنِ رخ کہتا ہے یہ ہیں بنو ہاشم کے قمر
دل جو جعفرؓ کا ہے پہلو میں تو حمزہؓ کا جگر
علمِ سبطِ نبی سایہ فگن ہے سر پر
رجزِ شیر ہے آوازۂ حق کی صورت
رن میں یہ آیا ہے اک آیۂ حق کی صورت

منفرد شیر کا انداز رجز خوانی ہے
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ زباں دانی ہے
مضمر الفاظ میں یا قوتِ ایمانی ہے
سن کے ہر دیو کے پتھر کا جگر پانی ہے
حرف حرف اس کا ہے یا تیغ ید اللہ کی کاٹ
کرتا ہے ابنِ علیؑ مسلکِ گمراہ کی کاٹ

آج عباسؑ کی شمشیر زباں چلتی ہے
اس کے آگے کسی جابر کی کہاں چلتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ لفظوں کی سناں چلتی ہے
دوش آواز پہ کشتیٔ بیاں چلتی ہے
تشنہ لب کوئی جو دریائے عطش پار کرے
سیر و سیراب پہ تب جا کے کہیں وار کرے

پسرِ شیرِ الٰہی سرِ میداں گرجا — بج گیا ہیبت آواز کا رَن میں ڈنکا
سب کو للکار کے یوں ضیغمِ حیدر نے کہا — کوفیو شامیو تم نے نہ ہمیں پہچانا

شیر دل ہیں اسد بیشۂ پیکار ہیں ہم
غیر فرار بن حیدرِ کرار ہیں ہم

قوت بازوئے شبیر خوش اطوار ہیں ہم — جاں نثار قدم سید ابرار ہیں ہم
فوج جو خلد میں ہے اسکے علمدار ہیں ہم — بھاری لاکھوں پہ ہیں ہر چند دل افگار ہیں ہم

اب بھی کیا میوۂ بیعت طلبی چکھنا ہے
اب بھی کیا جھوٹی شجاعت کا بھرم رکھنا ہے

ایک حملہ جو کریں حیدری انداز سے ہم — خاک میں فوج مخالف کا ملے جاہ و حشم
ہر سردار قلم کرلے یہ شمشیر دو دم — نہ تو لشکر کا پتہ ہو نہ نظر آئے نہ علم

پیادے، اسوار بہ عنوان تباہی بھاگیں
پیر رکھ رکھ کے سروں پر یہ سپاہی بھاگیں

سن کے یہ چال نئی ظالم و خونخوار چلے — حکم حاکم نے دیا چاہئے تلوار چلے
نام کے واسطے منصب کے طلبگار چلے — دوش پہ رکھ کے کمانوں کو کماندار چلے

تیر آنے لگے آغاز لڑائی کا ہوا
صلح کیسی کہ سر انجام صفائی کا ہوا

جب رہا بے ادبوں کو نہ ادب کا کوئی پاس — پٹری فارس نے جمائی تو لی ہاتھوں میں راس
حملہ آور ہوا دشمن پہ بہادر عباس — دم کیا فتح نے بازوے جری پہ والناس

غل ہوا فوجِ یزیدی پہ زوال آتا ہے
غیظ میں حیدرِ کرار کا لال آتا ہے

جیسے ہی ابنِ یداللہ نے مہمیز کیا / اپنی رفتار کو گھوڑے نے بھی کچھ تیز کیا

تیز تر جیسے ہی علمدار نے شدیز کیا / حُسنِ سرعت کو فرس نے بھی دلآویز کیا

کاوے کاٹے صفِ اعدا میں وہ کوندا پہونچا

قعرِ فوجِ ستم کیش میں یا جا پہونچا

تیز رو تیز قدم صاحبِ رفتار فرس / رن میں ثابت قدم اور جنگ میں سیاّر فرس

بھوک اور پیاس کے عالم میں بھی تیار فرس / خود وفادار ہے فارس تو وفادار فرس

جانور صاحبِ احساس بہت کم ہوں گے

قدر داں جس کے ہوں عباسؑ بہت کم ہوں گے

تھوتھنی اور کنوتی ہے کہ تصویرِ جمال / یہ چمکتا ہوا ماتھا یہ طرحدار ایال

کسی معشوق کی زلفیں ہیں کہ ہیں دُم کے بال / برق وش ماہ جبیں رنگ میں آہو تمثال

جب یہ چلتا ہے صبا خاک قدم لیتی ہے

جب یہ رُکتا ہے تو رفتار بھی دم لیتی ہے

ہنہنایا جو یہ بلبل نے کہا عمر دراز / دیکھ کر رنگِ بدن گُل نے کہا عمر دراز

حُسنِ رفتار پہ دلدل نے کہا عمر دراز / غیظ میں پھینکا جو کف مَل نے کہا عمر دراز

ہر قدم سُم کی تگاپو سے صدائیں نکلیں

اس تگاور کے لئے دل سے دعائیں نکلیں

گرد انگیز سرِ عرصۂ پیکار ہے سُم / روشنی کے لئے میداں میں شرربار ہے سُم

شوخ فطرت ہے سمجھدار۔ طرحدار ہے سُم / ٹھوکریں مارنے کو تاج پہ تیار ہے سُم

یہ بھی دُلدُل کے گھرانے کا فرس ہے شاید

عمر اس کی یہی چھ سات برس ہے شاید

باگ پہ ہاتھ رکابوں میں ہیں پائے اطہر سوئے اعدا بڑھا جاتا ہے علیؑ کا دلبر
حملہ کرتا ہے تو ہو جاتا ہے تتر بتر لشکر کوئی گرتا ہے ادھر بھاگتا ہے کوئی ادھر

ہے جلالی پسرِ شیرِ خدا کی صورت
تیغ عباسؑ کی چلتی ہے قضا کی صورت

سیف خونریز ہے سیاف ہے مشاقِ مصاف منہ کی کھاتی ہے وہ فوج آتی ہے ہو کر جو خلاف
دیکھیے کیا ہو کہ تلوار نے چھوڑا ہے غلاف شور ہے شور کہ لشکر سے ہوا میداں صاف

تیغ ستھراؤ پہ مائل ہے خدا خیر کرے
سامنے موت کی منزل ہے خدا خیر کرے

تیغ عباسؑ نے اعدا پہ اٹھائی دیکھو جو کبھی ہوتی ہے کس طرح لڑائی دیکھو
حملہ ور شیر ببر سو ہے ترائی دیکھو سر اڑے جاتے ہیں ہاتھوں کی صفائی دیکھو

غل یہ میداں میں اٹھا ہوش سنبھالو بھاگو
جان اپنی جو بچانی ہے بچا لو بھاگو

نکلی کاٹھی سے چمک کر جو برنگِ قاتل کاٹا دشمن کا جگر پھر گیا دو ٹکڑے دل
دمبدم نادِ علیؑ پڑھتی ہے تیغ عامل تاک لیتی ہے جسے کرتی ہے رنگیں بسمل

اس سے بچنا بھی تو اک فن ہے سبھی جانتے ہیں
لوہا اس تیغ کا ارباب ہمم مانتے ہیں

آب ایسی ہے کہ سب کہتے ہیں آبی تلوار ہو گئی پی کے لہو آج گلابی تلوار
مست پھرتی ہے بھر سو یہ شرابی تلوار فوج پر جب کہ جھپٹتی ہے عقابی تلوار

پہلوانوں کا بدن کانپتا تھراتا ہے
طائرِ روح عدو پنجے میں آ جاتا ہے

فتح کا باب نیا جنگ میں کھولا جو چلی — سرِ دشمن پہ گرا خوف کا اولا جو چلی
ہو کے سنجیدہ صفِ غیر کو تولا جو چلی — فوج پہ گر پڑا ذرّات کا گولا جو چلی
یہ پرا صاف وہ صف صاف یہ لشکر مفرور
اس کے چلنے کی خبر سن کے ہوئے سر مفرور

ہے یہی سحر رواں ہوش فراموش ہے تیغ — ہاتھ میں ابنِ یداللہ کے حق کوش ہے تیغ
آتش افروز بھی ہے صاعقہ بر دوش ہے تیغ — بادۂ خونِ عدو پائے تو مے نوش ہے تیغ
رقص میدان میں کرتی ہے پری کی صورت
توڑ دیتی ہے سروں کو یہ گری کی صورت

جب چلی یہ تو کہا تیغ یداللہ نے واہ — پرِ جبریل پکار اُٹھا عیاذاً باللہ
قہر نے بڑھ کے صدا دی کہ نہیں جائے پناہ — موت سائے کی طرح چلتی ہے اسکے ہمراہ
دشمنِ حق کو یہ پیغام فنا دیتی ہے
راستہ نارِ جہنم کا دکھا دیتی ہے

ڈوب کر خون کے دریا میں نہائی تلوار — بن گئی جنگ کے میدان میں جنائی تلوار
یہ کفِ دستِ دلآرام کی جائی تلوار — سیکڑوں مر گئے جب ہوش میں آئی تلوار
اپنی جھنکار کو لوری یہ بنا کر پلٹی
موت کی گود میں دشمن کو سلا کر پلٹی

رنگ ہر لمحہ بدلتی ہے طرحدار ہے یہ — کبھی نیزہ کبھی بھالا کبھی تلوار ہے یہ
کبھی خنجر ہے سروہی کبھی سوفار ہے یہ — شیر وش جنگ کے میدان میں خونخوار ہے یہ
زرہ بکتر کی تو مغفر کی خبر لیتی ہے
کاٹ کر خود کو یہ سر کی خبر لیتی ہے

سامنے آیا جو وہ قتل دم جنگ ہوا　　وار اک تیغ دو دم کا پڑا چہ رنگ ہوا
نشۂ کبر مٹا سارا نشہ بھنگ ہوا　　موت سے تیغ کا جب شور ہم آہنگ ہوا

تیغ عباسؑ کی سوئے صف ناری پہونچی
ملک الموت کی میداں میں سواری پہونچی

آیا مشکل سے مقابل میں اگر کوئی شقی　　شرم احباب سے کی اس نے مبارزطلبی
شان کے ساتھ پکارا یہی عباسؑ جری　　ابتدا جنگ کی کر دشمن اللہ و نبیؐ

زشت خو، پست، دنی، بندۂ زر تیغ اٹھا
آبرو باختہ مردود سیر تیغ اٹھا

اس نے آغاز کیا جنگ کا تلوار چلی　　پھر تو عباسؑ کی بھی تیغ شرربار چلی
سر و گردن پہ لگاتی ہوئی اک وار چلی　　روح دشمن کی بصد خوف سوئے نار چلی

مل گئی خوب سزا مسلک بیباکی کو
روح نے چھوڑ دیا خود جسدِ خاکی کو

پہلواں سامنے جو آیا وہی گرد ہوا　　ثابت اس رزم کے ہنگام میں نامرد ہوا
گرمیٔ تیغ سے سرکش کا بدن سرد ہوا　　روئے منحوس خجالت کے سبب زرد ہوا

یہ رسالہ ہوا پسپا تو وہ صف ٹوٹ گئی
ہمت جنگ سر دست جو تھی چھوٹ گئی

فلک فن پہ وہ خورشید منور ابھرا　　لشکر شام میں کیا خوب غضنفر ابھرا
جنگ کے آئینے میں صورت جوہر ابھرا　　نہر سے مشک سکینہ کو وہ بھر کر ابھرا

عزم و ایثار میں ہمرنگ علیؑ ہے عباسؑ
اعتمادِ حرمِ سبط نبیؐ ہے عباسؑ

بھاگا میداں سے بصد خوف یزیدی لشکر نہ رہا مد مقابل کوئی تا حد نظر
نہر پہ کر لیا قبضہ جو بشانِ حیدر نکلا دریا سے بھری مشک لئے وہ صفدر

رکھ لیا نام وفا پیاس میں پانی نہ پیا
لکھا ہے سیرت عباسؑ میں پانی نہ پیا

پا سکا جب نہ دم تشنہ دہانی پانی ساقیٔ کوثر و تسنیم کا جانی پانی
شرم سے دہر میں دریا رہیں پانی پانی عطشِ کرب و بلا کی ہے نشانی پانی

شہ کے اطفال اور انصار کا آتا ہے خیال
ساتھ پانی کے علمدارؑ کا آتا ہے خیال

جنگ عباسؑ نے کی جوہر ایثار کھلے اور کمالات فن حیدر کرار کھلے
دشمن مذہب خالق دم پیکار کھلے ڈھول میں پول تھا سربستہ یہ اسرار کھلے

ڈہل جنگ بجا کوس کی گونجی آواز
بن گئی بکھری ہوئی فوج کی پونجی آواز

مشک بھر کر جو چلا سوئے خیام شبیرؑ شر پہ آمادہ ہوئے فوج مخالف کے شریر
ظلم کرنے پہ تھے تیار سراسر بے پیر حرملہ سے پسر سعد نے کی یہ تقریر

تیر اک ایسا لگا مشک کا پانی بہہ جائے
مثل خوں طنطنۂ جوش جوانی بہہ جائے

ناوک ظلم نے صد حیف بہایا پانی بہہ گیا ریت پہ خیمے میں نہ آیا پانی
کوزے خالی رہے مٹی میں سمایا پانی پیاسے بچوں نے شہ دیں کے نہ پایا پانی

آسرا بالی سکینہؑ کا جو تھا ٹوٹ گیا
دلِ عباسؑ بصد شرم وفا ٹوٹ گیا

خیمے میں جاتے ہوئے آیا جری کو جو حجاب　　　موڑ دی باگ سوئے نہر بہادر نے شتاب
یاد آئی جو سکینہؑ تو بہ چشم پُر آب　　　سوچا عباسؑ نے بچی کو میں کیا دونگا جواب
العطش کی وہ جگر سوز صدا آتی ہے
جاؤں کس منہ سے میں خیمے میں حیا آتی ہے
دشمنوں نے جو یہ دیکھا کہ ہے پھرا ہوا شیر　　　قابو دریا پہ نہ پا جائے کہیں پھر سے دلیر
پسر سعدؔ نے آواز یہ دی کیا ہے دیر　　　آب شمشیر سے پیاسے کو کرو تیں سیر
گھیر کے شیر ید اللہ کو مارو لوگو
تیغ سے فرق علمدار اتارو لوگو
سن کے یہ نکلا کمیں گاہ سے نوفلؔ بد کار　　　اور کیا بازوے عباسؑ پہ اک ایسا وار
کٹ گیا شیر کا شانہ تو علیؑ کا دلدار　　　دوسرے ہاتھ میں لے کر علم شہ اک بار
جیسے چاہا کہ سنبھل جائے ذرا میداں میں
دوسرے ہاتھ پہ بھی وار ہوا میداں میں
سر پہ پھر گرز لگا گر گیا تیورا کے جری　　　کہا عباسؑ نے چلا کے کہ اے سبط نبیؐ
جان اپنی رہ مولا میں وفادار نے دی　　　السلام ابن رسول عربی المکیؐ
آخری وقت ہے امداد کو آؤ آقا
جلوۂ چہرۂ پرُ نور دکھاؤ آقا
ٹھوکریں کھاتے ہوئے رن میں ادھر اور ادھر　　　ہاتھ سے تھامے ہوئے شاہ ضعیفی میں کمر
لاش عباسؑ پہ پہونچے تو کہا یہ رو کر　　　بھائی قربان ہوا اے جان برادر تم پہ
جان و دل سے تمہیں بھائی ہے ترا ئی بھائی
چھوڑ کر مجھکو بسائی ہے ترائی بھائی

شاہ چلائے نجف سے چلے آؤ بابا رحم تنہائی شبیرؑ پہ کھاؤ بابا
ہے یہی وقت اب اعجاز دکھاؤ بابا اپنے عباسؑ کو مرنے سے بچاؤ بابا
بے سہارا ہوا جاتا ہے حسینؑ اے بابا
جیتے جی مل نہیں سکتا اسے چین اے بابا

بیکسی میں شہ دیں لائے بفوطِ غم و یاس خبر رحلت عباسؑ بجائے عباسؑ
خیمے میں نوحہ و ماتم تھا بپا سب تھے اُداس کہتے تھے زینبِ کبریٰ سے شہِ خلد اساس
سخت تر مرحلہ صبر، بہن باقی ہے
امتحانِ غم بازو و رسن باقی ہے

کوئی کہہ دے یہ سکینہؑ سے بصد کاش کہ آہ نام پانی کا زباں پہ نہ اب آئے ناگاہ
اب تو عباسؑ بھی دنیا سے گئے سوئے الٰہ پیاس بجھنے کا سہارا نہیں اے رشکِ ماہ
باپ کے بعد زمانے کا ستم سہنا ہے
قید خانے میں یتیموں کی طرح رہنا ہے

۱۹۸۱ء

نوحہ

سقائے آلِ احمدِ مختار مرگیا حیدر کا لال شہ کا علمدار مرگیا
قبضے میں نہر کر کے بھی پانی نہیں پیا دریا پہ شور ہے کہ وفادار مرگیا
خیمے میں بین زوجۂ عباسؑ کے ہیں یہ وارث ہمارا، شاہ کا غمخوار مرگیا
شانے کٹا کے نہر پہ اسلام کے لئے دینِ رسولِ حق کا مددگار مرگیا
کہتے ہیں رو کے لاشۂ عباسؑ پہ حسینؑ ہے ہے ہمارا جعفرِ طیّار مرگیا
ماتم بپا ہے خیمۂ آلِ رسولؐ میں نورِ نگاہِ حیدرِ کرار مرگیا
جائیں حرم جو قید میں تو کیا عجب ہے ناموسِ مصطفےٰ کا یہ ستار مرگیا

۱۹۸۸ء

باب قصائد

رباعی

انساں عملاً فکر کی رو موڑ چکا — ہر گاہ طلسماتِ مکاں توڑ چکا
ہے شیخ کو معراج میں اب بھی اشکال؟ — جب عامِ بشر سطحِ زمیں چھوڑ چکا

نعت حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

معراج میں ظاہر ہوئی یہ شانِ محمدؐ — ہے کوچۂ واجب حدِ امکانِ محمدؐ
چہرے پہ ہیں یہ گیسوئے پیچانِ محمدؐ — یا دستِ بلالیؓ میں ہے قرآنِ محمدؐ
مسلم سے کہو دیکھ لے فرمانِ محمدؐ — ہیں شبّرؑ و شبیرؑ دل و جانِ محمدؐ
خود کلکِ مشیّت نے ازل ہی میں لکھی تھی — تخلیق کی تاریخ بعنوانِ محمدؐ
معلوم نہ ہو تم کو تو قرآن سے پوچھو — اک مرکزِ تطہیر ہے ایوانِ محمدؐ
یہ رزق بھی صدقہ ہے رسولِ عربیؐ کا — کھاتا ہے ہر انساں نمک و نانِ محمدؐ
کاشانۂ تہذیب کی رونق یہ پکاری — اے نوعِ بشر تجھ پہ یہ ہے احسانِ محمدؐ
رحمت کی طرح سایہ فگن روزِ جزا ہے — اے صلِّ علیٰ وسعتِ دامانِ محمدؐ
ہے ان کے تصدق میں ہر اک چیز کی خلقت — ہر چیز نہ پھر کیسے ہو قربانِ محمدؐ
ان پہ نہ حکومت نہ تو دولت کا اثر ہے — اونچا ہے بہت نفسِ غلامانِ محمدؐ
محبوبِ زلیخائے شہادت ہے جہاں میں — سردارِ جناں یوسفِ کنعانِ محمدؐ
انسان کبھی مقصدِ خلقت کو نہ بھولے — ہے ملکِ خدا میں یہی اعلانِ محمدؐ
اے شیخِ حرم ڈھونڈھ لے تو اپنا ٹھکانا — فردوس پہ قابض ہیں ثنا خوانِ محمدؐ
لکھوا لو مگر آج ہی جنت کا قبالہ — ہاتھوں میں علیؑ کے ہے قلمدانِ محمدؐ

۱۹۶۳ء

قصیدہ در نعت سرورِ کونین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خلق ہو کر میں ہوا کچھ یوں پشیمانِ وجود
ہو گیا رخصت جو دل میں تھا وہ ارمانِ وجود

زندگی کی پھانس بن کر تھی نفس آشنا
اضطراب آثار یہ زلفِ پریشانِ وجود

جب ہوائے عشق راس آئی تو آخر بن گیا
باعثِ خنکیٔ چشم و دل گلستانِ وجود

سوسنِ لب، سنبلِ گیسو، گلِ رخ، سروِ قد
نرگسِ دیدہ بہ مژگاں، حسنِ ترکانِ وجود

یہ علاماتِ تصور آفرین و حس نواز
بن گئے ہیں باعثِ ادراکِ وجدانِ وجود

دیدۂ دل مائلِ بادہ کشی ہو کر تو دیکھ
ہوش میں لاتا ہے کیسے جامِ عرفانِ وجود

لمحہ لمحہ ہے اسیرِ پنجۂ مرگ و حیات
وقت کے ہاتھوں میں ہے اک جامِ گردانِ وجود

زندگی دشوار کر دیتے ہیں اہلِ عشق پر
یہ جوانی رس، یہ پری وش، فتنہ سامانِ وجود

ذوقِ خود بینی کرے پیدا جو امکانِ وجود
ذہنِ انساں کو ملیں کیسے نہ عنوانِ وجود

اللہ اللہ دستِ فکرِ خود نمائی کے طفیل
ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا از خود گریبانِ وجود

خط کشی، آئینہ سازی، صنعتِ صورت گری
ہیں وسیع النوع ہر صورت سے امکانِ وجود

احمدؐ و زہراؑ و حیدرؑ، شبرؑ و شبیرؑ سے
خلق خالق نے کئے ہیں پانچ ارکانِ وجود

تا ابد روشن رہے گا یونہی دارِ زندگی
ذاتِ پاکِ مصطفےٰ ہے شمعِ ایوانِ وجود

مطلعِ مدحت سے ہوتی ہے ثنائے مصطفےٰ
بزم میں کرتا ہوں میں آغازِ قرآنِ وجود

ہستیٔ واجب اگر ہے کنزِ فیضانِ وجود
مصطفےٰ کی ذات ہے معراجِ امکانِ وجود

رحمۃ للعلمین اے جانِ جانانِ وجود
درِّ مقصودِ دو عالم ابرِ نیسانِ وجود

نورِ چشمِ شاہدِ کُن راحتِ جانِ وجود
صاحبِ لولاک اے محبوبِ یزدانِ وجود

خسروِ روزِ ازل احمدؐ کو خالق نے کیا
حیدرِ کرار نے پایا قلمدانِ وجود

رحمتِ عالم کے دستِ پاک کے اعجاز سے
کنکری تلوار بنتی ہے بہ فیضانِ وجود

"باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار"
یہ مقولہ ہے عیارِ حُسنِ ایمان و وجود

شمعِ کعبہ اور چراغِ طور ہے ذاتِ رسولؐ
ہے ضیا بخشِ دو عالم حُسنِ جانانِ وجود

زندگی کی ہے علامت محفلِ کونین میں
گرمیٔ بازارِ گفتارِ ثناخوانِ وجود

تا ابد زندہ رہیں گے مدحِ مولا کے طفیل
عالمِ امکاں میں مدّاحانِ سلطانِ وجود

شاعرِ دربارِ فخرِ نوحؑ کا پیکر ہے یا
کشتیٔ صد آرزو بالائے طوفانِ وجود

ہو عطا حسنینؑ کا صدقہ نمؔر کو یا نبیؐ
اک بھکاری دہر میں ہے یہ بعنوانِ وجود

۱۹۶۰ء

قصیدہ مدحِ سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کیفِ ہستی تمام تر کم ہے
زندگی حسرتوں کا ماتم ہے

اس کی تشریح ہو سکی نہ کبھی
آرزو ایک لفظِ مبہم ہے

زندگی ہے کہ رزمگاہِ گماں
کشمکش ہے کہ ناک میں دم ہے

دل ہے نامحرمِ غمِ توبہ
لطف یہ ہے زبان محرم ہے

مستحبّاتِ عشق پر ہے نظر
ترکِ اولیٰ گناہِ آدم ہے

میوۂ آرزو ہیں بیم و رجا
دونوں میں ایک ربطِ باہم ہے

کھینچی ہے مجھے شبیہہِ حُسن
قلب قرطاس غنکہ مرسم ہے

حُسن اور وہ بھی پیشِ آئینہ
ایک عالم درونِ عالم ہے

نیّرِ مہر و ماہ و انجم کی
کائناتِ جمال برہم ہے

صاف ابروئے دوست تیغِ خطا
جنبشِ چشم آہوئے رم ہے

عشق آوارہ گردِ عرصۂ ہوش
عقلِ مجنونِ قریۂ غم ہے

گرمیٔ حشر خوشہ چینِ نفس
آہ ناسورِ عرشِ اعظم ہے

یہ گرانباریٔ نفس توبہ
انگبینِ حیات بھی سم ہے

سیلِ فکر رواں معاذ اللہ
ہر یقیں اب گماں میں ضم ہے

تھک گئی راہِ انتظارِ حیات
نیم خوابی کا اب تو عالم ہے

مٹ گیا فرقِ اندک و بسیار
بحرِ موّاج جامِ شبنم ہے

یہ تصوّر ہے میگسارانہ
ظرفِ خالی بھی ساغرِ جم ہے

میرا ساقی بہ فیضِ رحمتِ حق
دہر میں رحمتِ مجسّم ہے

اس کی مدحت میں لکھوں مطلعِ نو
رازِ میخانہ کا جو محرم ہے

(مطلع ثانی)
پردۂ میم سرِّ عالم ہے
نامِ احمدؐ بھی اسمِ اعظم ہے

ارضِ مکّہ پہ فضلِ خالق سے
بارشِ نور آج پیہم ہے

عشرتِ جلوۂ محمدؐ سے
دور دنیا کے دل سے ہر غم ہے

نورِ حسنِ ازل کا شان کے ساتھ
صحنِ عالم میں خیر مقدم ہے

ہیں بتانِ حرم بھی سجدے میں
در خورِ اعتنا یہ عالم ہے

یہ ہے احساسِ کمتریٔ صنم
گردنِ بت فروش بھی خم ہے

گل ہے آتشکدہ بھی ایراں کا
اہرمن کا نظام برہم ہے

فتنہ ابلیسِ لعیں کا ہوا ٹھنڈا
نارِ محجوبِ خاکِ آدم ہے

قصرِ کسریٰ کے کنگرے ہیں گواہ
جو سرِ پُر غرور ہے خم ہے

ہیں مساوات ہی کے اب چرچے
عیدِ مزدور عیدِ عالم ہے

اور ہی کچھ ہے اب نظامِ حیات
متّقی پیشِ حق مکرّم ہے

جلوہ گر ہو گیا ہے نورِ حبیبؐ
یعنی بیدار بختِ آدم ہے

چشم نرگس بہ جلوۂ احمدؐ
باغ میں حیرتِ مجسّم ہے

سامنے کاکلِ پیمبرؐ کے
زلفِ سنبل بصد ادب خم ہے

باغ میں حسنِ قدِ سروِ سہی
قدِ احمدؐ سے حسن میں کم ہے

مسکراہٹ ہے گلستاں بردوش
یہ بھی اعجازِ حسنِ خاتمؐ ہے

ذاتِ خالق کا ذاتِ پاک نبیؐ
ایک آئینہ قدِ آدم ہے

جزوِ احمدؐ ہیں شبّرؑ و شبیرؑ
نور ہر رنگ میں مکرّم ہے

انکی خوشیاں رسولؐ کی خوشیاں
ان کا ہر غم رسولؐ کا غم ہے

عشقِ آلِ نبیؐ بہ فیضِ خدا
روحِ سلمانؓ و جانِ میثمؓ ہے

خواجۂ بوذرؓ و بلالؓ و اویسؓ
پاسبانِ رسولِ اکرم ہے

فرطِ عصیاں سے تنگ عرصۂ عیش
چشمِ احساس اے خدا نم ہے

از پئے مصطفےٰؐ و آلِ عباؑ
طالبِ رحم قلب پُر غم ہے

ہو ثمرؔ پہ نگاہِ بخششِ خاص
شاعرِ بارگاہِ خاتمؐ ہے

۱۰ مئی ۱۹۵۵ء

قصیدہ در منقبت امیر المومنین حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام

ذرّۂ خاک ہے آئینۂ حسنِ تمکیں
دہر ہے عالمِ تصویر کہ بتخانۂ چیں

حسن ہے آج بھی پردے میں بقدرِ جلوہ
صورتِ حرفِ غلط ہیچ جہانِ تزئیں

خواہشِ جلوہ نمائی ہے کہ اللہ اللہ
اک طلسمات کا عالم ہے بہ فیضِ خودبیں

اعتباراتِ اضافی پہ ہے قائم سب کچھ
پستئ ملکِ زمیں رفعتِ افلاک بریں

موجِ گل موجِ ہوا موجِ نگاہِ احساس
حسن زا، حرص فزا، جلوہ گہہِ وہم و یقیں

نگہہِ برق و نمِ ابر و خمِ زلفِ بہار
عارض و چشم زدہ، قیدئ دامِ تمکیں

نالۂ سازِ طلب مطربِ بزمِ حسرت — نفسِ دل ہے کہ ہے دودِ چراغِ رنگیں
قصرِ پیرینہ عزا خانۂ حسن و الفت — غمِ فرہاد میں شامل غمِ مرگِ شیریں
روز و شب ضابطۂ فطرتِ اوّل کے ورق — کتنے دلچسپ ہیں یہ ہست و عدم کے آئیں
زلفِ تخیل میں پیچیدگیٔ دیر و حرم — شغل مشاطگیٔ عقل بذوقِ تسکیں
ساغرِ دل ہے کہ ہے میکدۂ احساسات — نغمۂ لغزشِ پا خوگرِ سازِ تحسیں
خوبیٔ بخت کہ ان پہ ہے مدارِ تقدیر — یہ جو کاواک لکیریں ہیں سرِ لوحِ جبیں
نفع و نقصاں ہیں ریاضیٔ ہوس کے اسباق — جنت و نار خیالات کے ہیں خوابِ حسیں
ایک جادے پہ نہیں پائے طلب کی رفتار — گاہ ہے سوئے یسار اور کبھی سوئے یمیں
اللہ اللہ یہ نیرنگیٔ اوصافِ جمال — ایک صورت ہے کہیں دوسری صورت ہے کہیں
آئینہ خانۂ حسنِ ازلی ہے دنیا — لطف یہ ہے کہ فقط ایک ہی تصویر نہیں
عالمِ وصف خدا داد وجہِ حیرت — پیکرِ احسنِ تقویم منقش بہ زمیں
جو بھی اظہار کی حد میں تھے صفاتِ خالق — ذاتِ حیدرؑ میں وہی کل صفتیں جمع ہوئیں
بابِ توصیفِ علیؑ میں جو زباں کھلتی ہے — نطق ہوتا ہے مری فکرِ معلّٰی کا معیں

(مطلع ثانی)

یا علیؑ دستِ خدا بازوئے پیغمبرؐ دیں — مصدرِ خلقتِ کونین دو عالم کے امیں
تفرقہ ذات و صفت میں جو ہوا روزِ ازل — صفتیں ذات کی تیری متجسس نکلیں
تو نہ ہوتا تو تھے محتاجِ تعارف اوصاف — تیرے آئینے میں اوصاف کی شکلیں ابھریں
اس سے بڑھ کر کوئی عالم میں سعادت ہوگی — ہے زچہ خانہ ترا کعبۂ اربابِ یقیں
بعد پیغمبرؐ اسلام تو مولائے زماں — دونوں کے بیچ میں واللہ کوئی فصل نہیں
جھک گئے سجدۂ خالق میں صنم کعبے کے — تو نے تبدیل کئے دیر و حرم کے آئیں
آستانے پہ ترے ناصیہ سا سورۂ دہر — کھینچ لائی ہے فلک سے کششِ نانِ جویں

وحدتِ ذات میں کثرت کی نمائش دیکھی
تجھکو دنیائے ولایت میں محمدؐ سے وہ ہیں
وصلِ نوروز و غدیر ایک قرانِ السعدین
شبِ معراج کا قصہ ہے زباں زد اب تک
تیرے ہی مکتبِ عرفاں میں رہا ابجد خواں
تھے نہ پہلے یہ ایس وحیِ خدا کے ادیب
نفسِ حق نفسِ نبیؐ مظہرِ ذاتِ باری
مرضئِ خالقِ کونین خریدی سو کر
موجزن علم کا دریا ہے ترے سینے میں
لحنِ داؤدؑ ترے حسنِ بلاغت پہ نثار
حسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا کی قسم
کفر و بدعت کے ہلے دل تری تکبیروں سے
کس سے ہو سکتا ہے احصائے سخاوت تیرا
کعبۂ روح و دل و چشم، ہدایت آثار
وہ شجاعت درِ خیبر تری دو انگلی پہ
جب ہوا تیرا کرم مائلِ فیضانِ جہاں
منشئِ لوحِ قدر محتسبِ کلکِ قضا
مرحبا وہ تری اک ضربتِ یوم الخندق
جنبشِ تیغ تری تیز ہے ماشاء اللہ
نظرِ بد سے ہے محفوظ جو دلدل ہے ترا

دعوتیں تو نے جو چالیس گھروں میں کھائیں
نسبتیں حضرتِ موسیٰؑ سے جو ہارون کو تھیں
عید کا دن ہے یہی از پئے افلاک و زمیں
ہاتھ تیرا یدِ قدرت ہے بفتوائے یقیں
وہ جو سردارِ ملائک ہے بجشنِ تمکیں
تجھ سے جبرئیل نے قربت کی ادائیں سیکھیں
تیری ہستی ہے کہ ایمان کا اک حصنِ حصیں
ایسا تاجر نظر آیا نہ خریدار کہیں
لینے والا سرِ عالم کوئی ملتا ہی نہیں
لہجۂ گفتگوئے لب ہے کہ قندِ شیریں
انبیائے ملکِ مراتب میں ترے خوشہ چیں
سایۂ دامنِ عصمت میں ہوا دیں مکیں
چرخ والے بھی ترے در کے گدا و مسکیں
نورِ فانوسِ ازل شمعِ رہِ علم و یقیں
وہ نزاکت کہ نہیں ٹوٹ سکی نانِ جویں
دامنِ عفو میں عصیاں نے پناہیں ڈھونڈھی تھیں
تیرے دربارِ قضایا کے مددگار و معیں
جس پہ سو جاں سے فدا طاعتِ افلاک و زمیں
اس قدر تیز رم دیدۂ معشوق نہیں
اس کی پروا نہ براقِ نبویؐ کے ہے قریں

مدح خواں ہے تری انجیل و زبور و تورات
اک صحیفہ تری مدحت کا ہے قرآنِ مبیں

میثمؓ و قنبرؓ و سلمانؓ و ابوذرؓ کا وقار
ان کے سر پہ تری طاعت کا ہے تاجِ زریں

زوجہ زہراؑ ہیں تو فرزند حسنؑ اور حسینؑ
صاحبِ فخر کوئی تجھ سا زمانے میں نہیں

دوستوں کو ترے جنّت کی بشارت زیبا
دشمنوں پر ترے افلاک و زمیں کی نفریں

مثلِ دیدارِ خدا مدحتِ حیدرؑ ہے محال
بس اسی بات سے مجبور ہوئے کرّوبیں

نام سے تیرے دعا مانگوں تو سُکانِ فلک
ہے یقیں دل کو کہ سو بار کہیں گے آمیں

یا علیؑ آپ کا بندہ ہے گنہ گار شمرؔ
درِ مولا پہ یہ حاضر ہے بہ شکلِ مسکیں

عشقِ آلِ نبویؐ دل میں رہے تا بہ ابد
چین پائے سرِ عالم یہ دلِ زار و حزیں

بارشِ رحمتِ باری ہو ترے صدقے میں
منفعل ہو نہ یہ محشر میں گنہ گار کہیں

دارِ ہستی میں رہے خوش تو رہے بعد اجل
مجھ پہ سایہ ترے الطاف کا اے خسروِ دیں

لُطف تو جب ہے کہ ہو کلکِ مشیّت جُنباں
آستانہ ہو ترا اور مری لوحِ جبیں

۱۹۵۷ء

تمت بالخیر

سوانحی کوائف

نام: سید وضاحت حسین رضوی
پیدائش: یکم جولائی ۱۹۵۹ء
وطن: قصبہ اور پوسٹ: ہلور، ضلع سدھارتھ نگر
تعلیم: ایم۔اے۔، پی ایچ۔ڈی۔(اردو)
گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
ملازمت: اسسٹنٹ ڈائرکٹر اطلاعات
انچارج میڈیا سنٹر (وزیر اعلیٰ پریس کیمپس)
ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'
تصانیف: اردو ناولٹ کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ
ہیرے پتھر (علامہ قمر ہلوری)
دیوان قمر (علامہ قمر ہلوری)
ہندی کے نمائندہ افسانے (زیر طبع)
ناولٹ: (انتخاب مضامین) (زیر طبع)
پتہ: آر۔ایس ۱۶/۳ ہلکیٹ رائے ایل۔ڈی۔اے۔ کالونی
لکھنؤ۔۱۷
رابطہ: دفتر۔۲۲۳۷۰۰۲، ۹۴۱۵۰۰۷۶۹۸
رہائش: ۲۶۴۹۰۴۳
ای۔میل: wazahatrizvi@sify.com
mediacentre2007radiffmail.com
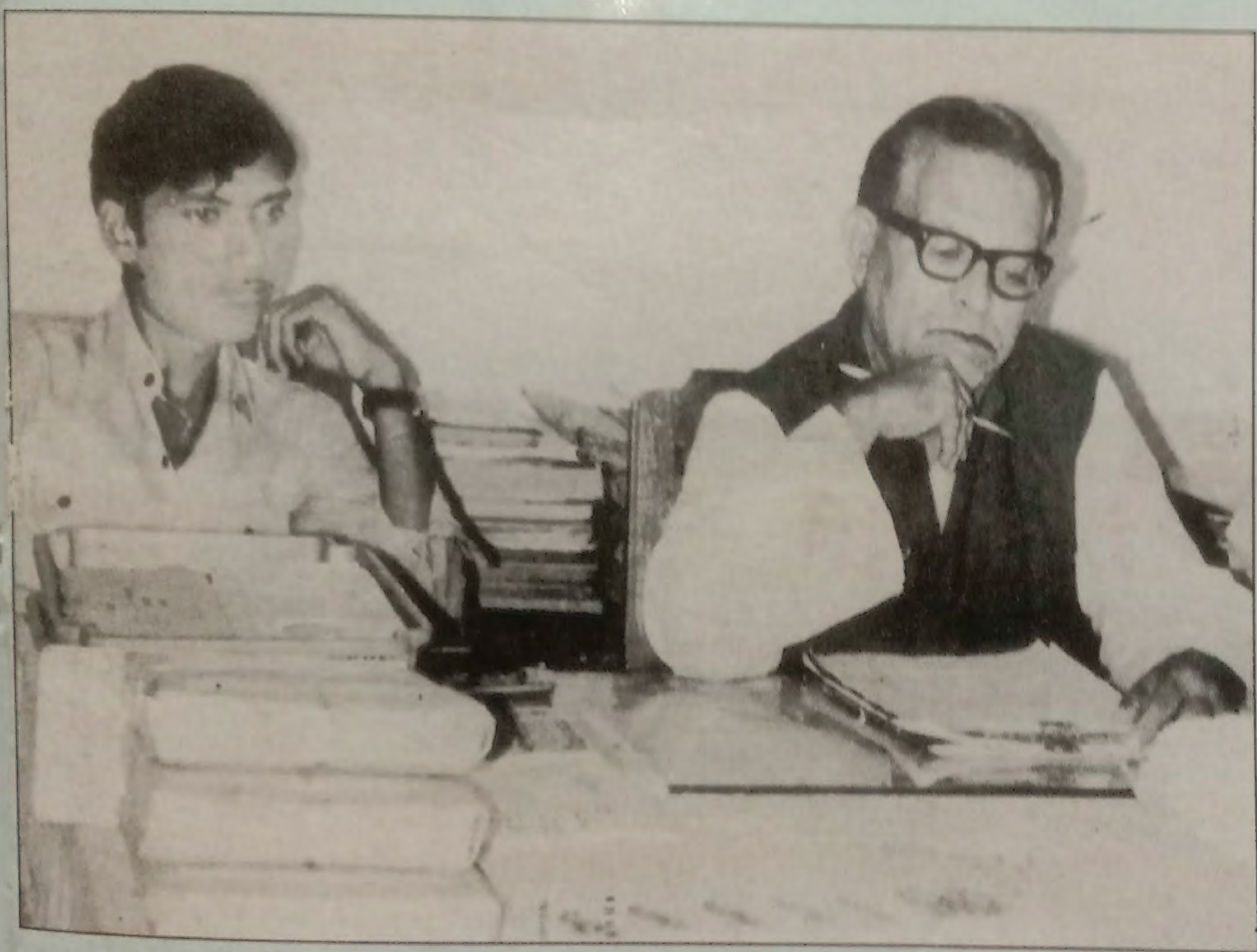
علامہ ثمر ہلوری کے ساتھ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی (۱۹۷۹ء)